# ZINDAGI KE SATTAR SAAL

# زندگی کے ستر سال

***By Anwar Motan***

# TABLE OF CONTENTS

## Contents

### Contents


Preface ..... 3

CHAPTER 1 ..... 5

خواب ..... 5

CHAPTER 2 ..... 9

بچپن ..... 9

CHAPTER 3 ..... 19

دادا کا خاندان ..... 19

CHAPTER 4 ..... 21

نانی کا خاندان ..... 21

CHAPTER 5 ..... 23

1965 TO 1972 ..... 23

CHAPTER 6 ..... 38

1972 TO 1985 ..... 38

CHAPTER 7 ..... 66

1985 TO 1998 - LIFE IN SAUDI ARABIA ..... 66

CHAPTER 8 ..... 79

1998 TO PRESENT ..... 79

CHAPTER 9 ..... 98

STORY OF MY DAD MOHAMMAD A. KARIM MOTON IN HIS OWN WORDS ..... 98

CHAPTER 10 ..... 111

LESSONS LEARNED ..... 111

# Preface

ایک کافی ذمہ داری ہے. میں نے کئی ،کسی کے ورثے کی دستاویز کرنا، خاص طور پر جب اسے ہزاروں سال کے لیے نظرانداز کیا گیا ہو ۔سالوں کی تحقیق کے بعد اپنے لوگوں کی کہانی سنانے کا بیڑا اٹھایا اور اسے 2006 میں ہسٹری آف میمنز کے نام سے شائع کیا

میری 60 ویں سالگرہ پر، میری نواسی تیشا نور، جو اس وقت 7 سال کی تھیں، نے صاف صاف مجھے بتایا کہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ لیکن میں نے اپنے آپکو صحت مند محسوس کیا اور، امریکی معیار کے مطابق، میں ابھی درمیانی عمر میں داخل ہو رہا تھا۔ پھر بھی، میں نے اپنے آپ سے ۔وعدہ کیا کہ میں یہ کام شروع کروں گا

اپنی زندگی کے تجربات کی دستاویز کرنا اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو چکی ہو
اور جیسا کہ میں نے لکھا ہے، میں ان غلطیوں سے سیکھے گئے اسباق کو بھی دستاویز کروں گا جو میں نے راستے میں کی ہیں تاکہ آنے والی نسلوں کو ان کی نقل سے بچنے میں مدد ملے۔ میں نے اپنا ذہن بھی بنایا کہ میں 44 سال افرادی قوت میں رہنے کے بعد 62 سال کی عمر میں جلد ریٹائرمنٹ کا مطالبہ کروں گا، پاکستان میں اپنے کام کو شمار نہیں کروں گا، جہاں میں نے زندگی میں کام شروع کیا تھا۔ لہذا، میں نے اپنے فیصلے سے دو سال پہلے میرے باس کو مطلع کر دیا۔ جلد ریٹائر ہونے سے مجھے اپنے نواسے بچوں کے ساتھ گزارنے اور اپنی زندگی کے تجربات کو دستاویز کرنے کے لیے زیادہ وقت ملا ہے۔ اللہ کا بہت بڑا احسان جب میں نے سعودی عرب میں مشاورتی کام لیا - اس وقت، میرے دو بچے تھے ایک سوا سال کی اور دوسرا 2 سال کا تھے - اس موقع نے میری بیوی یاسمین اور میں دونوں کو اپنے بچوں کے ساتھ چھٹیوں پر جانے اور جوان اور صحت مند ہونے کے دوران دنیا کو دیکھنے کے لیے مزید وقت دیا۔ ثقافت اور مذہب الگ الگ وجود ہیں، اس کے باوجود ہمارا اپنا معاشرہ ان ثقافتی غلط فہمیوں اور غیر مذہبی سوچ کو جاری رکھنے کو ترجیح دیتا ہے جو ان کی بہوؤں کے ساتھ ناروا سلوک کا باعث بنتے ہیں۔ وحشیانہ رویہ کچھ لڑکوں یا لڑکیوں تک بھی بڑھایا جاتا ہے جب کسی پسماندہ خاندان میں بہت زیادہ بچے ہوں۔ بچوں کے ساتھ زیادتی ہمارے معاشرے میں ایک وائرس بن چکی ہے اور نامعلوم وجوہات کی بنا پر آج بھی بڑھ رہی ہے۔ بزرگوں کا احترام مذہبی فریضہ ہے - تاہم، بہو کے ساتھ امتیازی سلوک ایک ثقافتی رویہ ہونا چاہیے جب والدین اور مذہبی رہنما عقلی طور پر سوچنا شروع کر دیں اور سائنس حقائق کو تسلیم کر لیں تب ہی اس کا خاتمہ ہو گا۔ کچھ لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ناروا سلوک کے نتیجے میں طویل المیعاد نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں جو ان بچوں کو زندگی بھر افسردہ اور ناراضگی سے بھر دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے بالغ افراد کے ساتھ اکیسوی صدی کے طبی طریقوں سے علاج کیا جاسکتا ہے ، اگرچہ، بدقسمتی سے، ان رویوں کو ذہنی امراض کے طور پر تسلیم کرنا اور علاج کرنا ہمارے معاشرے میں ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ میری بیوی میری ماں کے ساتھ ساتھ میرے ایک بھائی اور بہن کا بھی شکار بنی، حالانکہ ہماری زندگی کا بیشتر حصہ پاکستان سے باہر رہا۔ اس کا اثر اتنا ہوا کہ یاسمین نے ہمارے خاندان کے ان افراد کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے انکار کر دیا۔

کسی نہ کسی طرح، میرے والد کو بدسلوکی کا علم ہوا لیکن اس وقت بات نہیں کی۔ اگرچہ امی کو اپنی بعد کی زندگی میں ہونے والے نقصان کا احساس ہو گیا تھا اور انہوں نے خلوص دل سے یاسمین سے معافی مانگی تھی، لیکن زخم بھرنے میں بہت دیر لگتی ھے - اگرچہ یہ لکھنا سب سے مشکل کام ہے، میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری زندگی کے تجربات کو درست طریقے سے مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ بامعنی لکھنے کی رہنمائی فرمائے ۔

سبق سیکھا. مجھے اپنی اہلیہ پر فخر ہے جس نے ان دنوں کے میموری سیلز کو کھول کر یاد رکھنے میں میری مدد کی ہے تاکہ میں حقائق کو درست طریقے سے دستاویز کر سکوں۔ کئی سالوں سے، میں ہر رات سونے سے پہلے اپنی ڈائری میں لکھتا تھا۔ بدقسمتی سے جب میں سعودی عرب چلا گیا تو میں نے غلطی سے وہ ڈائری اپنے والدین کے پاس چھوڑ دی، جو اخبارات کے ساتھ فروخت ہوئی تھی۔ جب میں اس کتاب کو ختم کرنے اور اپنے حصے کو دوبارہ شروع کرنے کے درمیان اپنا وقت تقسیم کر رہا ہوں تو میری اہلیہ نے بہت صبر کیا ہے۔ پارٹ ٹائم جاب، اور میانمار (برما) میں اپنے فارماسیوٹیکل ایکسپورٹ بزنس کو بھی برقرار رکھنا۔ میں ایک بار پھر ڈاکٹر رابرٹ ہولبسن کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تدوین کے لیے اپنا وقت وقف کیا، ساتھ ہی میری پچھلی کتاب، ہسٹری آف میمنز۔ میرے تمام اہل خانہ کے لیے، براہ کرم مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں جب آپ اس کتاب کو پڑھ رہے ہیں۔ براہ کرم اس بات کا احساس کریں کہ اپنے آپ کو فوری طور پر اپنے خاندان کے ساتھ مصروف رکھنا اور ان لوگوں کی طرف کان نا لگانا کتنا ضروری ہے جو آپ کی سوچ اور طرز عمل کے خلاف ہیں۔ میری دعائیں ان کے لیے بھی۔ اللہ (خدا) سب سے پہلے مجھے ہدایت دے اور وہ برے سلوک کے اثرات کو سمجھیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الفلق میں اللہ تعالیٰ ہمیں (113:5) تمام برائیوں اور نظر بد سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیتا ہے: _"اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے اللہ تعالیٰ ہم سب کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ آمین

میری تمام قارئین سے گزارش ہے کہ برائے مہربانی "ماشاء اللہ" ضرور کہیں یعنی انشاء اللہ میرا مقصد صرف آنے والی نسلوں کو رہنمائی فراہم کرنا ہے ۔

کسی کو نیچا دکھانے کا ارادہ نہیں لیکن ان واقعات سے سیکھا سبق سکھانا ہے۔ یہ اسباق دوسروں کو ان غلطیوں سے بچنے میں مدد کریں گے اور امید ہے کہ اس زندگی سے بھرپور لطف اٹھائیں۔ میں ہر اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، لیکن میں ایک سبق کبھی اتنا قریب نہ ہو کہ آپ مجھے دوبارہ تکلیف دے ۔ بھی سیکھتا ہوں، میں تم سے نفرت نہیں کروں گا، لیکن قریب بھی نہیں آؤں گا سکیں۔ میں اپنی معافی ک حماقت نہیں بننے دے سکتا۔ ٹونی گاسکنز

جب کوئی اتنا ہوشیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مایوسی کا اظہار کر سکے تو وہ گندے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ *گندے الفاظ ذہانت کی کمی کو بیان کرتے ہیں*۔ ذہین لوگ گندے الفاظ استعمال نہیں کرتے، کیونکہ وہ اسے اپنی ذہانت کی توہین سمجھتے ہیں۔ - نعمان علی خ

# CHAPTER 1

## خواب

میں کراچی، پاکستان میں پیدا ہوا، محمد اور مومن موتن کے ۱۰بچوں میں سب سے بڑا ہوں۔ میرے والدین ہندوستان کے جیٹ پور نامی گاؤں سے ہجرت کرگئے، جب ہندوستان ۱۹۴۷میں ہندوستان اور پاکستان کی دو قوموں میں تقسیم ہوا تھا۔ ہم تیرہویں نسل کے مسلمان ہیں، ہندوؤں سے تبدیل ہوئے، خدا کی وحدانیت پر بنیادی عقیدہ رکھتے ہیں، روزانہ پانچ نمازیں ۲ ۱/۲٪ صدقات ہر سال کی بچت سے (زکوٰۃ)، رمضان المبارک کے ۳۰ دن کے روزے، اور زندگی میں ایک بار مکہ مکرمہ کا سفر، مالی وسائل کی اجازت ہے۔ کراچی ۳۰ میل سے زیادہ ساحل کے ساتھ سب سے بڑا شہر ہے۔ انگریزوں نے کچھ اچھے ساحل ۔بنائے تھے جہاں میں نے اپنے بچپن کا لطف اٹھایا تھا۔ میں نے کرکٹ کھیلی اور تیراکی کا لطف اٹھایا

کیونکہ میرا خاندان بہت غریب تھا، مجھے ۱۶سال کی عمر میں کام شروع کرنا پڑا۔ میں نے ایک مشین شاپ میں لیتھ مشینوں پر کام کرنا شروع کیا اور بعد میں سٹینو ٹائپسٹ کے طور پر کام کیا۔ جب میں کراچی کے ڈی جے سائنس کالج میں فرسٹ ایئر میں تھا تو میرا ایک کزن امریکہ سے ملنے آیا اور وہاں کی زندگی کو ایک خواب کی تعبیر بتایا۔ عمل آسان تھا۔ مجھے غیر ملکی کے ٹیسٹ طور پر انگریزی کا ٹیسٹ دینا تھا اور امریکی کالج میں داخلے کے لیے درخواست دینا تھی۔ ہفتوں کے اندر، مجھے کراچی میں امریکی سفارت خانے سے طالب علم کا ویزا مل گیا، اور میں امریکہ جانے کے لیے تیار تھا۔ یہ شکاگو شہر میں تھا جہاں میں ۲۷مئی ۱۹۷۲کو اترا، اور امریکہ میں اپنے پہلے کالج کیریئر کا آغاز کیا۔ میرے ایک دوست امین فطانی نے میرا تعارف ایک فرانسیسی شیف سے کرایا اور میں نے جان ہینکوک سنٹر کی ۹۵ منزل پر واقع ایک پوش ریسٹورنٹ میں کام کرنا ۔شروع کر دیا

کالج کے اخراجات بہت زیادہ تھے، اور میں شکاگو کے سرد موسم کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دو روم میٹ اور میں نے اگست ۱۹۷۳میں ہیوسٹن منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یونیورسٹی آف ہیوسٹن کے اخراجات شکاگو کے اسکولوں سے بہت ۔کم تھے۔ میرا داخلہ کالج آف نیچرل سائنسز اینڈ میتھمیٹک میں ہوا۔ یہیں سے میں نے اپنا پہلا ڈیٹا پروسیسنگ کورس کیا

شیئرنگ یہ ٹائم۔ شیئرنگ سسٹم تھا۔ میرا جلد ہی ڈیٹا پوائنٹ کارپوریشن سے UNIVAC 1108 اور IBM 360 تعارف کرایا گیا، جہاں میرے ایک دوست نے گریجویشن کے بعد کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے کمپنی کے اکاؤنٹ کے قابل ۔وصول پروگراموں کے ساتھ کچھ مسائل کو درست کرنے میں مدد کے لیے عارضی بنیادوں پر رکھا گیا تھا

مجھے سیف وے اسٹورز میں نائٹ اسٹاکر کے طور پر۱۹۷۵ میں نوکری مل گئی۔ میں (ایکسٹینڈڈ سٹور لیول سکیننگ) فائلوں کو ۔ڈاؤن لوڈ کرنے اور قیمت کی تبدیلیوں کو لاگو کرنے کا بھی ذمہ دار تھا

اپریل 1979 میں، میں 7 سال کے طویل عرصے کے بعد وطن واپس آیا اور اپنی بیوی یاسمین سے منگنی کر لی۔ اکتوبر 1979 میں، جب میں شادی کے لیے پاکستان جانے کی تیاری کر رہا تھا، مجھے ہمارے ڈویژن آفس میں ڈیٹا پروسیسنگ مینیجر ڈیوڈ ویرمین کا فون آیا۔ اس نے فون پر میرا انٹرویو کیا اور مجھے آنے اور ملنے کو کہا۔ یہ میری پیشہ ورانہ زندگی کا اہم موڑ تھا، جو میرا کیریئر بننا تھا اسے شروع کرنے کا ایک حقیقی موقع تھا۔ میں نے اگلے دن ڈیوڈ سے ملاقات کی، اور اس نے مجھے ۔ایک جونیئر پروگرامر کے طور پر نوکری کی پیشکش کی، آر پی جی اور اسمبلر زبانوں کے ساتھ کام کرناتھا

یاسمین اور میں ہماری شادی اسی سال نومبر میں ہوئی اور واپس ہیوسٹن آگئے۔ ہمارا پہلا بچہ شرمین 26 دسمبر 1980 کو پیدا ہوئی۔ یہ اللہ کی ایک شاندار نعمت تھی۔ 10 جون 1983 کو ہمارا دوسرا بچہ نعمان پیدا ہوا۔ ایک بار پھر میری زندگی نے ایک اچھا موڑ لیا اور میں نے اپنی زندگی میں مزید تعلیم اور مواقع کا انتخاب کیا۔ ڈیوڈ کے ساتھ، میں نے شروع سے ہی ڈیٹا انٹری کلرک سے لے کر پروگرامر تک معلوماتی ٹیکنالوجی کی ملازمتوں کی مکمل رینج سیکھی۔ آخر کار اس نے مجھے سسٹمز ۔پروگرامنگ کی تربیت دی، اور میں سینئر سسٹم پروگرامر بن گیا

اس دوران، میں نے اپنے چارچچا کو کینسر سے کھو دیا۔ سبھی اپنی چالیس کے وسط اور پچاس کی دہائی کے اوائل میں تھے، اور ان کی قبل از وقت موت نے میرے اندر ہسپتالوں کے لیے کام کرنے کی خواہش کو جنم دیا۔ میں نے ہسپتال کارپوریشنز آف امریکہ کے ساتھ درخواست دی۔ ہفتوں کے اندر، ریاض، سعودی عرب میں کنگ فیصل ہسپتال میں پروجیکٹ لیڈ پوزیشن کے لیے میرا انٹرویو ہوا۔ میرا خاندان بہت پرجوش تھا۔ اس پوزیشن نے ایک منافع بخش، ٹیکس سے پاک تنخواہ، ہر سال چھ ہفتے کی چھٹیاں، ادا شدہ رہائش، اور ہر سال پورے خاندان کے لیے سفری ٹکٹ کی پیشکش کی۔ جولائی 1985 میں، میں نے پہلی بار ہسپتال کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ شاہ فیصل کے لیے کام کرنا ریٹیل انڈسٹری میں کام کرنے

سے بہت مختلف تھا، اس لیے مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ میں نے پرانے پیکیج کے ساتھ شروع کیا جو میکرو اور کمانڈ لیول میں لکھا ہوا ہے اورڈیٹا بیس چلا رہا ہے۔ اسمبلر کے کئی معمولات تھے۔ میں نے نئی/رجسٹریشن سسٹم کے لیے تازہ تفصیلات لکھیں اور مینو سے چلنے والے کمانڈ لیول کے پروگراموں میں تبدیل کر دیا۔ تبدیلی کامیاب رہی، اور صارفین نے اسے پسند کیا۔ یہ میری ٹیم کی اسائنمنٹس کا صرف آغاز تھا۔ ہم نے کئی کلینیکل ایپلی کیشنز تیار کیں اور دوبارہ لکھیں، بشمول ایک آؤٹ پیشنٹ فارمیسی ماڈیول شروع سے لکھا۔

انیسو نوے کی خلیجی جنگ نے کنگ فیصل ہسپتال میں آئی ٹی کا ڈھانچہ بدل دیا۔ ڈاکٹرز سمیت کئی شخصیات نے ہماری عیادت کی۔

کولمبیا کے پال کلیٹن اور سمترا سینگپتا، وینڈربلٹ کے ڈاکٹرڈین سیٹنگ، اور یونیورسٹی کے ڈاکٹر تھامس پین واشنگٹن قابل اہترام تھے۔

یہ ایک کلینکل انفارمیشن آرکیٹیکٹ کے طور پر میرے لیے سیکھنے کا ایک بہترین تجربہ تھا۔ جب ہسپتال میں انٹرنیٹ متعارف کرایا گیا تو میں نے معالجین اور رہائشیوں کو اس کے استعمال کی تربیت دینا شروع کی۔ میں ایڈوائزری کمیٹی برائے ایڈوانسڈ ٹیکنالوجی اینڈ پلاننگ کا حصہ بن گیا۔ جب تک میرے بچے 1998 میں ہائی اسکول سے فارغ ہوئے، ہم دنیا کے مختلف حصوں کے چالیس سے زیادہ دورے کر چکے تھے۔ تب ہی ہم نے ہیوسٹن واپس گھر آنے کا فیصلہ کیا۔

سال 2000 کے مسائل افق پر تھے، اور میں آر سی جی کی کنسلٹنگ فرم میں پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس سے مجھے میموریل ہرمن ہسپتال میں سال 2000 کی تیاری میں ان کی مستعدی کی تصدیق کرنے کا موقع ملا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک عارضی پوزیشن ہے، اس لیے، مستقل نوکری کی تلاش میں، میں نے نومبر 1999 میں ہیرس کاؤنٹی ہسپتال ڈسٹرکٹ میں درخواست دی تھی۔ جب مجھے ہیرس ہیلتھ سسٹم (ہیرس کاؤنٹی ہسپتال ڈسٹرکٹ) سے کال موصول ہوئی تو میں درخواست کے بارے میں بھول گیا تھا۔ میرا انٹرویو ایپلیکیشن سپورٹ مینیجر کے لیے ہوا تھا اور مئی 2000 میں اس عہدے پر بھرتی کیا گیا تھا۔ میں نے کلینیکل سسٹم کے ساتھ شروعات کی تھی اور مجھے ذیلی نظاموں اور انٹرفیس کے لیے اضافی ذمہ داریاں دی گئی تھیں۔ میں نے 2013 تک انسلری سسٹمز کے شعبے کا انتظام کیا جس میں امیجنگ (ریڈیالوجی، ڈیپارٹمنٹ کے ایمبولیٹری اور (HIS) کارڈیالوجی، جی آئی، پلمونری)، لیبارٹری اور پیتھالوجی، اور ہسپتال کے انفارمیشن سسٹمز

ان پیشنٹ فارمیسی سسٹم دونوں شامل تھے۔ پہلی کتاب، میمنز کی تاریخ، اور اپنے خاندان اور دوستوں کے لیے میری اپنی سائٹ بھی قائم کی۔ جون 2013 تک، مجھے ڈائریکٹر لیول کے عہدے پر ترقی دی گئی، جو ایمبولیٹری اور ان پیشنٹ فارمیسی سسٹم دونوں کے لیے ذمہ داری تھی۔ میں 44 سال افرادی قوت میں گزارنے اور اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد اب ریٹائر ہو گیا ہوں۔ ان سب کے درمیان، میں نے یکم مئی 2017 کو اپنی ماں کو کھو دیا اور 6 ماہ بعد میں نے اپنا 34 سالہ بیٹا نعمان، 24 اکتوبر، 2017 کو کھو دیا۔ اگرچہ یہ سال 2017 ہمارے لیے بہت مشکل رہا، لیکن یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔

میری اپنی سوانح عمری لکھنے کی خواہش ہے جو ایک واضح پیغام دیتی ہے جس میں مجھے درپیش چیلنجز بھی شامل ہیں، اور سب سے بڑھ کر میری اور دوسروں کی غلطیوں سے سیکھے گئے اسباق کو دستاویز کرنے کے لیے تاکہ آنے والی نسلیں سیکھ سکیں۔

# CHAPTER 2

## بچپن

میں 5 جنوری 1954 کو پیدا ہوا، میرے 13 ویں دادا مانیک جی کے قبول

اسلام کے تقریباً 500 سال بعد، 700 دیگر خاندانوں کے ساتھ، کراچی ک اردو بازار کے قریب واقع سوبراجھ میٹرنٹی ہسپتال میں۔ ہسپتال میری نانی (نانی) کے گھر کے قریب تھا اور اسے پارسی اور عیسائی راہبائیں چلاتی تھیں۔ ہم سب 10 بھائی اوربہنیں اسی ہسپتال میں پیدا ہوئیں۔ ہسپتال عوامی عطیات پر چلایا گیا اور مریض سے کبھی بھی ایک پیسہ نہیں لیا۔. میرا نام میرے دادا عبدالکریم کے نام پر رکھا گیا تھا۔ میری پیدائش کے پہلے چند مہینے بہت مشکل تھے۔ میں بیمار تھا اورپیٹ بہت خراب تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ میں کوئی کھانا نہیں روک سکتا تھااور میری صحت تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔ میری نانی (ماں کی نانی نے میرا نام بدل کر انور رکھ دیا (جس کا مطلب ہے "روشنی") اس امید پر کہ میں بہتر ہو جاؤں گی، اور یقین ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں میری ماں اور والد کے ساتھ تصویر ہے جب میں 8 ماہ کا تھا اور لگتا تھا کہ بہتر ہو رہا ہے۔

ہم رنچھور لائن میں ہو تھی مارکیٹ کے قریب انور علی بلڈنگ کی دوسری منزل پر رہتے تھے۔ میرے والد نے یہ فلیٹ ۲۵۰۰ روپے میں خریدا تھا۔ اور ہم وہاں 1953 سے 1967 تک رہے۔ میں خوش قسمت تھا کہ میں اس عمارت کی آخری تصویر 1988 میں پاکستان کے دورے کے دوران لی۔ عمارت اب موجود نہیں ہے۔ ہم 1967 میں ملحقہ عمارت میں چوتھی منزل پر رہنے چلے گئے،

یہ فلیٹ پچھلے فلیٹ سے تھوڑا بڑا اور نیا تھا جہاں ہم تھے۔ میرے والد نے اپنے باس، غلام احمد اسماعیل سے 4000 روپے ادھار لینے کے بعد یہ فلیٹ 7500 روپے میں خریدا۔ یہاں ہم 1967 سے 1973 تک رہے۔ میں مئی 1972 کے آخر میں شکاگو، امریکہ منتقل ہو چکا تھا۔

رنچھور لائنز کا علاقہ (جو اب غضدار آباد کہلاتا ہے) شہر کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر مارواڑی تھے۔ ان میں سے کئی کی اپنی بھینسیں اور گائیں تھیں - ان کی کمائی زیادہ تر ان گایوں اور بھینسوں کے دودھ سے ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم جس گلی میں رہتے تھے اس پر ان گایوں اور بھینسوں کا قبضہ تھا۔ یہ گلی گندگی اور غلاظت سے بھری ہوتی تھی۔ ہمارے جوتے گندے کیے بغیر گلی سے گزرنا بہت مشکل تھا۔ ہم کبھی نہیں چلے بلکہ ان گندگی اور غلاظت پر مینڈکوں کی طرح

چھلانگ لگاتے رہے۔ ہمیں کبھی بھی محلے میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی، کیونکہ یہ علاقہ جواری چلاتے تھے۔ دوپہر کو کام پر جاتے ہوئے، میرے والد ہمیں نانی کے گھر کے قریب چھوڑ دیتے تھے، جہاں ہم اندھیرا ہونے تک کھیلتے تھے اور عام طور پر خود گھر آتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ ہمارا گھر انور علی بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا۔ شام کو جیسے ہی آپ عمارت میں داخل ہوئے آپ کو تازہ روٹیوں (روٹی) کی خوشبو آ رہی ہوتی - امی ہمارے لیے یہ روٹیاں بناتی تھیں اور جوں ہی وہ ہمیں گھر آتے دیکھتی تھیں، وہ ہمیں صاف کرنے میں مدد کرتی تھیں اور وہ ہمیں گھی اور چینی کے ساتھ گرم روٹیاں دیتی تھیں۔ والد صاحب تھوڑی دیر بعد آتے اور ہم سب بہن بھائی، امی، پاپا اور میرے ایک چچا کے ساتھ، ہمارا سادہ کھانا کھایا جاتا - رات کے کھانے کے بعد، ہم اپنے والد کے گرد جمع ہوتے، اور وہ اپنی ٹارزن کی کہانیاں شروع کرتے۔ ان میں سے زیادہ تر کہانیوں کا کوئی مطلب یا احساس نہیں تھا، لیکن ہم اس وقت ان میں سے ہر ایک سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ 1950 کی دہائی سے کئی بار وہ مکیش اور لتا منگیشکر کے گانے گاتے تھے۔ ان کے پسندیدہ میں سے کچھ شامل ہیں، "جہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سیوا کیا ہے" اور "اے دل مجھے بتا دے تو کس پہ آگیا وہ" وغیرہ۔ میرے چھوٹے بھائی ٹارزن کی کہانی ختم ہونے یا گانا سننے سے پہلے ہی سو جاتے تھے۔ آخر کار، میں اور میرا چھوٹا بھائی پچھلے کمرے میں فرش پر اپنا بستر بچھانے کے روزمرہ کے کام سے گزرتے اور سو جاتے۔

ایک بار، والد صاحب نے ہمیں دو محبت کرنے والوں کی کہانی سنائی جو صحرائے صحارا سے گزرے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ پریوں کی کہانی تھی لیلیٰ اور مجنون ہو یا کوئی اور، لیکن کہانی بہت دل کو چھو لینے والی تھی کہ اس رات ہم دونوں بھائی روئے تھے۔

میری یاد مجھے 1958 کی یاد دلاتی ہے جب میرے نانا ہمیشہ میرے اور میرے ساتھ کھیلتے تھے۔ چھوٹے بھائی اشرف۔ ہم دونوں بھائی اس کی پیٹھ پر چھلانگ لگاتے تھے اور اسے سونے نہیں دیتے تھے۔ لیکن وہ کبھی ناراض نہیں ہوتا تھا اور ہم دونوں کو بہت پیار کرتا تھا۔

ہم اپریل 1958 میں اپنی نانی کے گھر تھے، اچانک میری نانی نے دروازہ کھولا اور مجھے اپنے پیچھے پیچھے لے کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ میری خالہ زرینہ سیڑھیوں سے نیچے بھاگی، اور میں نے اپنی ماں کو سیڑھیوں کے نیچے دیکھا، ایک بچہ اپنی بانہوں میں پکڑے ہوئے تھا۔ وہ ابھی ہسپتال سے واپس آئی تھی جہاں اس نے ہمارے بھائی صمد کو جنم دیا تھا۔ اس کی جلد بہت پیلی تھی۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ کچھ بچوں کو پیدائش کے وقت یرقان ہو جاتا ہے اور وہ بڑے ہونے کے ساتھ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

جیسے ہی بانگی مسجد میں مؤذن صبح کی اذان دیتے، میرے والد صاحب اٹھ کر ہم دونوں بھائیوں کو جگا دیتے۔ وہ ہمیشہ ہم دونوں کے پیچھے ہوتے کہ وہ متحرک اور ورزش کرے، کیونکہ ان کا خواب تھا کہ ایک دن ہم پاک فضائیہ میں شامل ہوں - وہ ہمیں ہمیشہ لیکچر دیتے کہ ایک دن ہم ایئر فورس اکیڈمی میں شرکت کے لیے سرگودھا جائیں گے۔

ہمارے گھر میں ہم صرف کنویں سے پانی لیتے تھے - عمارت کے نیچے سیٹ اپ یہ پانی صرف غیرکاموں کے لیے اچھا تھا پینے کے لئے نہیں - کام جیسے کپڑے دھونا، نہانا وغیرہ۔

ہر رات آدھی رات کے قریب، یہ ایک پٹھان (شمال مغربی سرحدی صوبے سے تعلق رکھنے والا ایک پختون) کی باقاعدہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ وہ دستی ہینڈ پمپ کا عمل شروع کرے۔ اس پمپ کو چلانا بہت مشکل تھا کیونکہ یہ صرف مسلسل کرینکنگ سے پانی کو کنویں سے عمارت کے پانی کے ٹینک کے اوپر تک دھکیل دیتا تھا۔ یہ پٹھان سب سے پہلے اوپر کی منزل پر جاتا اور ہر یونٹ کے پانی کے تمام والوز بند کر دیتا۔ پھر آدھی رات سے صبح تک وہ اس پانی کو کنویں سے نکالتا رہتا۔ یہ ایک انتہائی محنتی کام تھا، جس کے لیے انہیں ان دنوں ماہانہ 100 روپے سے کم ملتے تھے۔

یہ ہم بھائی تھے جو حکومت کی طرف سے فراہم کردہ پانی کی لائنوں سے پینے کا پانی لانے کے ذمہ دار تھے۔ اس کام کا تقاضا تھا کہ ہم سب صبح سویرے لائن میں کھڑے ہو جائیں اور ایک ایک کر کے اس پینے کے پانی سے اپنی بالٹیاں بھرنا شروع کر دیں۔ ہر صبح ہم اس عمل سے گزرتے اور اپنی باریوں کے لیے قطار میں کھڑے رہتے۔ کئی بار خواتین کے درمیان چھوٹی موٹی لڑائی ہوتی تھی، لیکن صبح 9 بجے کے قریب پانی کے جانے سے پہلے ہی کسی نہ کسی طرح سب اپنا پانی نکال لیتے تھے۔ ہم ہانڈا نامی

بالٹیاں گھر لے آتے اور پینے کے پانی کے اپنے بڑے کنٹینرز، جسے مٹکیاں کہتے ہیں، بھر لیتے۔ یہ پانی پینے کے ساتھ ساتھ کھانا پکانے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

ہفتہ اور اتوار کو فجر کی نماز کے بعد ہم دونوں بھائی سب سے پہلے والد صاحب کے ساتھ برنس گارڈن کی طرف سفر کا آغاز کرتے۔ اپنی عمارت کی سیڑھیاں اتر کر گراؤنڈ فلور پر آتے، ہم ایک پنجابی خاندان کے فلیٹ کے پاس سے گزرتے۔ چونکہ ان کا باتھ روم سیڑھیوں کے قریب تھا، ہم خاندان کے سربراہ، ایک بوڑھے، بھاری سیٹ آدمی کو فطرت کی پکار کا جواب دیتے ہوئے "سونک بوم" کرتے ہوئے سن سکتے تھے۔ ہم سب ہنستے اور عمارت کے باہر بھاگتے۔ ایک بار جب ہم برنس گارڈن پہنچے تو میرے والد صاحب نے ہم دونوں کو وارم اپ کے طور پر سندھ مسلم کالج کے سامنے والے ایک گیٹ سے آخر تک اپنے ساتھ دوڑانے کو کہا جہاں دوسرا گیٹ فزیکل ہیلتھ کلچر انسٹی ٹیوٹ کے سامنے کھلتا تھا۔ اس کے بعد ہم صحت مرکز میں چلے جاتے جہاں وہ ہمیں 30 منٹ

تک مشقوں میں مشغول رکھتے تھے ۔ ہم بالکل تھکے ہارے گھر واپس جاتے جب ہم گھر پہنچتے تو ماں ہمارے لیے ناشتہ تیار کر چکی ہو ۔تی

ایک بار، والد صاحب نے ہم چاروں بھائیوں کو اپنے ساتھ فزیکل ہیلتھ کلچر میں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب ہم نے برنس گارڈن میں بھاگنا شروع کیا تو پیچھے رہ گئے ہمارے دو چھوٹے بھائی رونے لگے۔ ابا نہیں رکتے تھے۔ جب والد صاحب نے دیکھا کہ ہم بڑے بھائی، جو کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، سب رو رہے ہیں، تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ " تم سب میرے مضبوط شیر کے بچے ہو اور کبھی ڈرنا نہیں چاہیے۔ اب چپ ہو جاؤ اور رونا بند کرو۔" والد صاحب کی تسلی بخش باتیں سن کر ہم نے رونا بند ۔کرو

برنس گارڈن بھی ہماری ویک اینڈ پر تفریحی جگہ تھی، جہاں ہم چاروں بھائی، انور، یعنی میں، اشرف، مجھ سے 11 ماہ چھوٹا، منور ڈھائی سال چھوٹا، اور صمد ، ساڑھے چارسال چھوٹا، انگریز دور کے پرانے زنگ آلود جھولوں سے کھیلتے اور لطف اندوز ہوتے۔ باقی بہنیں اور بھائی اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وقت آنے پر ان کا ذکر کروں گا۔ ایک دن ایک بینچ پر بیٹھے پارسی جوڑے میں سے ایک نے ہم بھائیوں کو پہلوانوں کی طرح لڑتے دیکھا۔ جب وہ شخص چیخا، "یہ کس کے بچے ہیں؟" میرے والد نے جواب دیا، "ہاں، وہ میرے ہیں۔" ظاہر ہے پریشان، آدمی نے کہا، "آپ انہیں برتاؤ کرنا کیوں نہیں سکھاتے؟" ان پارسیوں کی عجیب گجراتی زبان میں ۔خود کو ڈانٹتے ہوئے سن کر، میرے والد جواباً صرف مسکرا کر ساری بات کو ہنس کر ختم کر دی

صبح سویرے کے کاموں میں سے ایک ہوٹل سے سویرے دودھ خریدنا تھا جہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ دودھ والا ایماندار ہے اور اس میں کبھی پانی نہیں ملایا جاتا۔ تو مجھے ایک بڑا ڈبہ دیا جاتا اور کہا جاتا کہ ایک لیٹر دودھ خریدوں۔ وہ جگہ ہماری جگہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی۔ میں ننگے پاؤں اس جگہ کی طرف دوڑتا اور اپنی بنیان اور براؤن شارٹس میں ملبوس ہوتا۔ اکثر میں محسوس کرتا ہوں کہ اپنے مشن کو دوبارہ شروع کرنے سے پہلے فطرت کی پکار کا جواب دینے کے لیے گھر لوٹنا پڑتا تو میری ماں پریشان ہو جاتی لیکن پرسکون ہو جاتی جب میں آخر میں دودھ واپس لے آتا. یہ فرض، وقت کے ساتھ ہی ساتھ بہت سے دوسرے، میرے چھوٹے بھائیوں پر پڑ ۔گئے

پچھلی راتوں کے ناشتے میں زیادہ تر گرم چائے اور روٹیاں ہوتی۔ جب والد کے پاس پیسے ہوتے تو وہ ناشتے کے لیے بکرے کا قیمہ یا بکرے کا جگر خرید لیتے۔ اور کئی بار وہ ہمیں جا کر انڈے خریدنے کو کہتے کہ انڈے بہت چھوٹے ہیں جب ہم واپس آتے تو وہ ہمیشہ ہمیں لیکچر دیتے اور کئی بار وہ ہمیں جا کر انڈے بدلنے کو کہتے۔ جب ہم واپس آتے، تو وہ ہمیشہ انڈوں کا سائز پھر سے چیک کرتے اور اکثر پریشان ہو جاتے ہمیں چونکہ ہم دونوں بھائی انڈوں کے ہاکر کا سامنا کرنے سے ڈرتے تھے، اس لیے ہم انڈوں کو ویسے ہی قبول کر لیتے تھے لیکن اپنے والد کو بتا دیتے تھے کہ اس شخص نے ان کی جگہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مبینہ انکار والد

کو اتنا پریشان کر دیتا کہ وہ اپنی لونگی (ایک عام دھوتی جسے میمن پہنتے ہیں) اور بنیان پہن کر باکر کو اس کے انڈے دینے کے لیے واپس لے جاتے۔ مکمل طور پر حیرانی کے عالم میں، وہ غریب آدمی دہراتا رہتا کہ کوئی شکایت نہیں ہوئی، لیکن والد صاحب نے ایک نہ سنتے اور بجائے اس کو دھمکی دیتے۔ باکر بالآخر انڈوں کو بدل دیتا اور والد صاحب اسے اگلی بار ہمارے چہرے یاد کرنے اور ہمیں قابل قبول سائز کے انڈے دینے کو کہتے۔

صبح سویرے ہمارے فرائض میں سے ایک یہ تھا کہ والد صاحب کے ساتھ جانا اور انہیں دن بھر کھانا پکانے کے لیے تازہ سبزیاں اور گوشت کی مصنوعات خریدتے دیکھنا۔ اس کے لیے وہ ہم میں سے دو بڑے بھائیوں کو اپنے ساتھ ہوتھی مارکیٹ لے جاتے۔ ہمارا پہلا پڑاؤ مولانا (ہمارے قصائی) کے ساتھ ہوں تا جہاں والد صاحب ان سے گوشت وغیرہ لیتے۔ بکرے کا گوشت خریدتے تقریباً 2/1 سیر (ایک سیر تقریباً کیلو1 کے برابر ہوتا ہے

کلو گرام، یا دو پاؤنڈ سے تھوڑا کم)۔ اس وقت بکرے کا گوشت ایک روپیہ اور 12 آنہ فی کلو تھا سولہ آنے کا ایک روپیہ (1 روپیہ = 100 پیسے) جیسے ہی ہم گوشت بازار سے باہر آتے وہاں تازہ سبزیاں بیچنے والے بہت سے سٹینڈز ہو تے اوروالد صاحب ٹماٹر، لہسن، ادرک، ہری لال مرچ، آلو اور ہری مرچ خریدتے۔ مجھے یاد ہے کہ یہ سبزی فروش (جس کا نام بھوریوتھا) کبھی بھی دھنیا یا ہری مرچوں کے لیے قیمت نہیں لیتا، اس لیے پوری قیمت زیادہ سے زیادہ 8 آنے (50 پیسے) ہوتی تھی۔

یہ جنوری 1959 میں کسی وقت کی بات ہے، جب میرے والدین نے ہم دونوں بھائیوں کا ختنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک ٹھنڈی صبح تھی جب حجام اپنا کام کرنے کے لیے تیار دکھائی دیا۔ ہم دونوں بھائیوں کو اس روایت کا کوئی علم نہیں تھا۔ دردناک رسم نے ہم دونوں کو درد سے چیختے ہوئے چھوڑ دیا۔ ہمیں بستر پر لٹا دیا گیا، صرف مسکراتے ہوئے مہمانوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ جب ہمارے زخم ٹھیک ہوئے تو ہم نے ہفتے میں ایک بار ایک خاتون ٹیچر سے قرآن سیکھنا شروع کیا۔

جلد ہی نانا نے شکایت شروع کر دی کہ وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہے ہیں یا توجہ نہیں دے پا رہے ہیں۔ ایک ماہر امراض چشم کے پاس جانے سے معلوم ہوا کہ انھیں موتیا ہو گیا ہے۔ اسے صبح سویرے ایک آؤٹ پیشنٹ کلینک میں داخل کرایا گیا، جہاں ان کی دونوں آنکھوں میں موتیا ہونے کا علاج ان کی آنکھوں کے مبہم قدرتی عینکوں کو ہٹا کر کیا گیا۔ میری ماں مجھے ان کے ساتھ ہسپتال کا دورہ کرانے لے گئیں تھیں۔

نانی کے مقام سے رتن تالاب سے گزرتے ہوئے سیدھا پیدل چلنا تھا جب تک کہ ایک کانٹے تک نہ پہنچ جائے جہاں سے سڑک سیدھی صدر تک جا سکتی تھی یا بائیں طرف جہاں اب تبت سینٹر ہے۔ تبت سینٹر کی تعمیر سے پہلے، یہ جگہ ایک بہت ہی چھوٹی

بیرونی مریضوں کے علاج کی تنظیم تھی جسے مقامی گرجا گھروں میں سے ایک چلاتا تھا۔ جب ہم مرکز میں داخل ہوئے تو نانا ایک چارپائی پر بیٹھے تھے، ان کی آنکھوں پر موٹے کپڑے کی پٹی تھی۔

کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا، ''انور بیٹا اُٹھی ون'' جس کا مطلب ہے ''انور اٹھو''۔ یہ میری ماں تھی جو مجھے جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ اگست 1959 کی ایک صبح ہمارے اپارٹمنٹ میں تھا۔ یہ اسکول میں میرا پہلا دن ہونا تھا۔ مجھے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اندھیرا تھا، اور ہمارے سروں کے اوپر ایک چھوٹا سا بلب کمرے میں واحد روشنی تھی، جس میں ہم دونوں بڑے بھائیوں کے سونے کی جگہ (فرش پر ایک گدے پر مشتمل) تھی، کچن کا ایک چھوٹا سا علاقہ، جہاں میری ماں استعمال کرتی تھی۔ کھانا پکانا، اور دھونے کی جگہ۔ یہ پچھلا کمرہ تھا۔ سامنے ایک اور کمرہ تھا جہاں میرے والدین سوتے تھے اور دو چھوٹے بھائی فرش پر سوتے تھے۔ اپارٹمنٹ کے باہر لیٹرین تھا۔

میں اور میرے والد سکول چلے گئے، جو اس اپارٹمنٹ سے دو سے تین میل دور تھا جہاں ہم رہتے تھے۔ میرے والد نے مجھے سرسید احمد اسکول میں کنڈرگارٹن میں داخل کرانے کے لیے پانچ روپے فیس ادا کی۔

میری ماں کم از کم ،سال 1954 سے، جب میں پیدا ہوا، 1967 تک، جب میری سب سے چھوٹی بہن محمودہ کی پیدائش ہوئی والد کی آمدنی ہمارے 10 بھائیوں اور بہنوں کے خاندان کے ساتھ ساتھ ایک 11 بار حامل ہوئی، اور 10 بچوں کو جنم دیا۔ میرے چچا کے لیے بمشکل کافی تھی، جو زندگی بھر حیدرآباد میں زیر علاج تھے۔

نیا نو دن پرانا سو دن! 1959 میں کسی امریکی صدر کا پاکستان کا پہلا دورہ تھا۔ میرے والد بہت پرجوش تھے، اور انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو صبح سویرے اس عظیم تقریب کے لیے تیار کیا۔ پاکستانی صدر ایوب خان کے ساتھ صدر کی گاڑی کو اس وقت کراچی کی مرکزی سڑک بندر روڈ سے گزرنا تھا، جسے بعد میں محمد علی جناح روڈ کا نام دیا گیا۔ دسمبر کا ایک اچھا ٹھنڈا دن تھا جب ہم تینوں بندر روڈ کے ایک طرف کھڑے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف ہزاروں لوگ قطار میں کھڑے تھے۔ کئی گھنٹوں کے بعد، گاڑی دکھائی دی، اور میں نے دیکھا کہ دونوں صدور کھڑے ہیں اور عوام پر ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ میری سائٹ پر ایک نظر ڈالیں اور اس فلم کے آئیکون پر کلک کریں جب صدر ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور کی گاڑی ہوائی اڈے سے کراچی کی طرف سفر کرتی ہے، سڑکوں پر اور عمارتوں سے ہجوم کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات میں ایک عظیم لمحے کی شاذ و نادر ہی دیکھنے والی تاریخی ویڈیو ہے۔

1960 کے اوائل میں میرے بھائی اشرف کو بھی نرسری کے سکول میں داخل کرایا گیا اور اب ہم دونوں باقاعدگی سے سکول جانے لگے تھے۔ میرے ایک ماموں (مامو) رؤف، جو اسی اسکول میں پڑھتے تھے، جب بھی ہم اپنی شارٹس پر داغ ڈالتے، ہمیں قریب ہی نانی کے گھر لے جاتے۔ ہمیں اپنی نانی سے تھوڑا سا تھپڑ مل جاتا لیکن وہ ہمیں صاف کرتی اور کھانا بھی کھلاتی۔

ایک دن ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے فیصلہ کیا کہ ہم سب کو اتوار کو ہاکس بے میں پکنک پر لے جائیں گے۔ میری امی نے کچھ کیما بنایا ہوا گوشت اور چند روٹیاں (روٹی) رکھنے کے بعد ہمیں چھوٹا لنچ باکس دیا، اور میرے والد نے ہمیں اسکول چھوڑ دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہم اکیلے پکنک پر جا رہے تھے۔ ہم سب کو ایک بس میں لادا گیا اور ہم ہاکس بے کی طرف جا رہے تھے جو کہ بہت سی جھونپڑیوں والا ایک خوبصورت ساحلی علاقہ ہے، جہاں آپ آرام کر سکتے ہیں اور لطف اندوز ہو سکتے ہیں، حالانکہ ہمارے اساتذہ نے ہمیں سمندر کے قریب نہ جانے کو کہا تھا۔ سارا دن کافی مزہ آیا۔

دیپتمان پڑھنے والی کتابوں سے ہمیشہ اچھی خوشبو آتی تھی۔ کسی وجہ سے، میں نے ایک کتاب "ادھار" لی جو میرے ایک ہم جماعت کی تھی اور اسے گھر لے آئی۔ کسی طرح والد صاحب کو پتہ چلا، اور میں نے اپنی پہلی تیز رفتار حاصل کی جو مجھے یاد ہے. یقیناً، مجھے کتاب واپس کرنی پڑی اور اپنے والدین سے وعدہ کرنا پڑا کہ ایسا دوبارہ کبھی نہیں ہوگا۔

1960 کا موسم گرما بہت گرم تھا، اور مجھے یاد ہے کہ میرے والد ہمارے دوپہر کے کھانے کے بعد دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیتے تھے اور دروازے اور کھڑکیوں کو بستر کی چادروں سے ڈھانپ دیتے تھے۔ اس سے گرمی کم ہو جائے گی، اور ہم چند گھنٹوں کے لیے سوئیں گے۔ اس سال، ہماری میمن برادری نے اعلان کیا کہ جیٹ پور میمن اسکول مکمل ہو گیا ہے اور بچوں کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ ہم دونوں بھائیوں کو منتقل کر کے جیٹ پور میمن انگلش پرائمری سکول میں ایک ہی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ اس لیے، خوش قسمتی سے، اشرف کو ایک پروموشن مل گیا اور اسے کبھی کنڈرگارٹن کلاس میں نہیں جانا پڑا۔

مامو کی شادی کی تقریبات کے طویل انتظار کے بعد تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دونوں میرے دونوں بڑے ماموں غفار مامو اور مجید کی منگنی دونوں خاندانوں نے منسوخ کر دی تو پور میں منگنی ہوئی تھی۔ جب چھوٹے مامو مجید بھائیوں کی پاکستان آنے سے پہلے جیت نانی کو زلیخا (جلو مامی) کے نام سے ایک اور خاتون مل گئی۔ ہم ایک دن نانی کے گھر جا رہے تھے اور شام کے قریب میرے والد اور مامو دونوں کو بلایا گیا نانا دونوں کام سے واپس آئے۔ نانا کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکیج تھا اور وہ پیکیج اپنے بستر پر رکھ دیا۔ غفار اور مجید اور انہیں پیکیج کھولنے کو کہا گیا۔ پیکیج میں شادی کے دو سوٹ تھے جو حال ہی میں سلائی کرنے والے ماسٹر نے تیار کیے تھے۔ دونوں بھائیوں نے اپنی شادی کے سوٹ آزمائے، جن میں جناح کیپس بھی شامل تھیں۔ میری نانی کہتی رہی کہ دونوں بھائی دولہے لگتے ہیں۔ سب بہت خوش تھے اور شادی کی تقریب کے منتظر تھے ''''وراجا۔

ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں پاکستانی تھیٹروں میں ہندوستانی فلمیں چلتی تھیں، لیکن والد صاحب ہمیں صرف انگریزی فلمیں دیکھنے فاریسٹ، ہتاری ٹارزن فائٹس فار ہز لائف، کنگ آف دا ان میں تھیں لے جاتے تھے۔ کچھ جو ہم نے ان دنوں کے دوران دیکھی ۔(جس میں جان وین نے اداکاری کی تھی) اور کئی دیگر

دسمبر 1960 کے کسی دن میرے رؤف ماموروتے ہوئے ہمارے گھر آئے اور مشکل سے بول سکے۔ ماموکی مختصر باتوں سے میری امی سمجھ گئیں کہ میرے نانا کو سینے میں درد ہو رہا ہے۔ میری ماں مجھے اپنے ساتھ لے گئی جبکہ باقی میرے والد کے ساتھ میں اپنے نانا کو ۔گھر رہے۔ اندر داخل ہوتے ہی سب رو رہے تھے۔ اچانک کسی نے مجھے دوسرے کمرے میں گھسیٹ لیا ہمارے بستر پر مشکل سے دیکھ سکتا تھا۔ ایک ڈاکٹر اس کی حالت کا پتہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میرے نانا جلد ہی ہمارے سامنے سے چل بسے۔ مجھے اس واقعے سے سیکھا ہوا ایک چھوٹا سا سبق ضرور لانا چاہیے، جو بعد کی زندگی میں مجھ پر واضح ہو گیا۔ جس وقت ڈاکٹر میرے نانا کا جائزہ لے رہے تھے، وہ واضح طور پر جانتے تھے کہ میرے نانا کو دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے صرف کچھ اقدامات کرنے سے بچا جا سکتا تھا، یعنی سی پی آر فراہم کر کے اسے قریبی ہسپتال لے جایا جا سکتا تھا۔ اس کے بجائے، نااہل ڈاکٹر پورے تیس منٹ کی اذیت ،یہ کہتا رہا کہ موت قریب ہے اور اس کے مریض کے جینے کے لیے صرف چند منٹ ہیں۔ درحقیقت میرا نانا یقینی طور پر مر گیا۔ میں نے جو سبق سیکھا وہ دو طرفہ تھا: کبھی بھی کسی ڈاکٹر کی رائے پر بھروسہ نہ کریں، اور کے بعد ۔ایمرجنسی میں اپنی عقل کا استعمال کریں

شادی کئی ماہ کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ جب آخرکار دن آ پہنچا تو ہم چاروں بھائی اپنے امی اور پاپا کے ساتھ تیار ہو کر نانی کے گھر ۔روانہ ہو گئے۔ دونوں بھائی نیچے اتر کر اس گاڑی میں بیٹھ گئے جو اس موقع پر تیار کی گئی تھی

میرے ایک چھوٹے بھائی سے کہا گیا کہ وہ ایک دولہے کو گود میں لے کر بیٹھ جائیں۔ تقریب برنس روڈ کے قریب جناح مسجد میں ۔تھی۔ یہ جلدی تھی اور ہم نانی گھر آ گئے۔ نانی گھر دوپہر کا کھانا خاندان اور سب کے لئے پیش کیا گیا تھا

۔ہم میں سے بہت تھکے ہوئے تھے، لیکن خواتین کو آمنہ منزل آنے کی دعوت تھی

جناح مسجد کے سامنے جہاں دلہنوں نے آنا تھا۔ خواتین گا رہی تھیں اور دونوں دلہنوں کو ہال میں لایا گیا۔ شو ختم ہونے کے بعد ۔دونوں دلہنوں کو نانی کے گھر لایا گیا اور پھر ہم کافی تھکے ہارے اپنے گھر روانہ ہوگئے

پور میمن سکول میں پڑھنا شروع سے ہی مزے کا رہا، ہمیں نئے دوست اور نئے اساتذہ کی پیشکش ہوئی۔ 1960 سے جیت ہمارے پہلی جماعت کے دو اساتذہ تھے جو 1965 تک ہمارے ساتھ تھے، پانچویں جماعت کے محمود شاہ اور سلام سبحانی۔ مجھے پہلی جماعت کے اپنے ہوم روم ٹیچر یاد نہیں لیکن ہم لڑکیوں کے ساتھ تھے۔ درجہ دوم، مس خالدہ ہماری ہوم روم ٹیچر تھیں۔ محمود شاہ

تیسری جماعت شروع کرتے ہوئے ہمارے کلاس ٹیچر بن گئے۔ اس نے ہمارے مستقبل کو سنوارنے میں مدد کی، ہمیشہ ہمیں انگریزی میں اچھی طرح سے بولنے اور لکھنے کی ترغیب دی۔ درحقیقت، جب بھی کوئی اپنی کلاس میں غیر انگریزی کا کوئی لفظ بولتا، تو اور اس وقت ہمیں اپنی جیب وہ طالب علم ایک پیسہ جرمانہ ادا کرتا۔ صرف واضح کرنے کے لئے، ایک روپیہ 100 پیسے کے برابر تھا ۔خرچ کے طور پر دو پیسے ملتے تھے۔ تو ایک پیسہ کافی جرمانہ تھا

آج پھر چاروں بھائوں کے دو دو پیسے ملا کر اسکول کے راستے میں ایک کھلونے والے سے یہ دوآنے میں کھلونا خریدنا تھا۔آج شائد اشرف یا منور کی باری تھی ۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اب یہ کھلونے والا کبھی نظر نہیں آئے گا ۔ وہ حجام کی دکان سے گزرتے ہوئے اس کے دو بیٹوں کو بھی ساتھ لینا ہوتا تھا اور ہم چار بھائیوں کے بال تھوڑے سستے میں کٹ جاتے ت

مجھے یاد ہے کہ اس جماعت سے شروع ہونے والے ہم دونوں بھائی اپنی نشستوں سے بلیک بورڈ پڑھنے سے قاصر تھے اور اپنے والدین سے شکایت کرتے تھے۔ ان شکایات کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تاہم، محمود شاہ، جو ہمارے مسئلے کو سمجھتے تھے کیونکہ اس نے خود عینک پہن رکھی تھی، ہمیں اگلی صف میں بٹھانا یقینی بنایا۔ یہ نقل مکانی ایک بڑی مدد تھی۔ اس جماعت کی کلاس میں میرا پہلا نمبر آیا۔ پہلی بار محمود شاہ سر نے مجھے نتائج کے اعلان کے دن ایک پھولوں کا ہار خریدنے کے لیے گھر بھیجا جو ہمارے جنرل سیکرٹری ۔عبداللہ کامدار کو پیش کیا جانا تھا۔ بعد میں ان کے دو بیٹے امین اور محمود میرے بہنوئی بن گئے

پوری کلاس کو1963میں ملیر کے فارموں میں لے گئے۔ وہاں بہت مزہ آیا۔ وہاں کچھ تصاویر لی ۔ محمود شاہ کو پکنک کا شوق تھا جنوری سے موسم سرما ان دنوں میں رمضان ۔گئں ان میں سے تین میں نے خریدی تھیں جس میں سے ایک آج میرے پاس ہے ۔کے مہینے میں آتے تھے

والدین ہمیں مہینے میں روزہ رکھنے دیں۔ ۔مجھے خاص طور اس سال یاد ہے ہم اپنے والدین سے روزہ رکھنے کیلئے زد کرنے لگے تھے ہمیں یہ موقع صرف ہفتے کے آخر میں دیا گیا تھا۔ اسکول میں یہ بہت شرمناک تھا کیونکہ اکثر بچے روزہ رکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد امین گل ہمارا بہترین دوست بن گیا اور ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ وہ وہی تھا جس نے ہماری ماں کو احترام کے ساتھ مخاطب کرنے پر اصرار کیا، جیسے ''تم'' کے بجائے ''آپ'' کہنا۔ وہ ہمیشہ رمضان کے روزے رکھتا تھا، اور میں بہت ناخوش تھا کہ ۔میں ایسا نہیں کر سکا

چوتھی جماعت میں، ہمارا تعارف ہمارے سائنس ٹیچر لارنس پنٹو سے ہوا، جنہوں نے ہمیں گانا بھی سکھایا۔ پورے اسکول کو دیے گئے پریزنٹیشنز میں سے ایک میں مجھے کنگ بننے کے لیے نامزد کیا گیا، جب کہ میرے ساتھی یوسف زکریا نے بھکاری کا کردار ادا :کیا۔ ہم دونوں نے وہ گانا بھی پیش کیا جو مجھے آج بھی یاد ہے

"اوہ گیو می آ ہوم "

یوسف زکریا اور مجھے دونوں کو اونٹ کے برانڈ کے قلم سے نوازا گیا اور مجھے پچھلے سال تیسری جماعت میں اول آنے پر اونٹ برانڈ کا ایک اور قلم بھی ملا۔ میں نے اونٹ کا قلم کئی سالوں تک اپنے پاس رکھا اور میں نے اپنا دوسرا قلم اپنے یونس ماموں کو دیا جو یہ تحفہ پا کر بہت خوش ہوئے۔

آسان نہیں تھا، لیکن ہم اس رمضان 1964 میں ہمیں پورا مہینہ روزے رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اگرچہ کھانے کے بغیر گزرا کرنا مسجد میں رات کے وقت روزے رکھنے اور تراویح (رات کی نماز) میں شرکت کا لطف اٹھایا نے کمیونٹی کی ایک مقامی مسجد، بانگی۔

چونکہ پانچویں جماعت جے ایم اے اسکول کی آخری جماعت ہونی تھی، اس لیے ہم نے بحث شروع کردی کہ ہم کس اسکول میں جائیں گے۔ خوش قسمتی سے، ہم میں سے زیادہ تر بچوں نے اگست 1965 میں ایمپریس مارکیٹ صدر کے قریب بمبئی میمن برادرہڈ اسکول میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اسی سال پاکستان اور بھارت مسئلہ کشمیر پر جنگ لڑ گئے، جو کبھی حل نہیں ہوسکی اور اب بھی ہے۔ 70+ سال سے زائد عرصے کے بعد تاخیر جنگ کے وہ 17 دن بہت دکھی تھے اور میں انہیں یاد نہیں کرنا چاہتا۔

# CHAPTER 3

## دادا کا خاندان

یہ 1454 کا سال تھا جب میرے 13ویں دادا نے تقریباً 700 دیگر خاندانوں کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ ان خاندانوں نے اس وقت نقل مکانی شروع کی جب، پیشین گوئی کے مطابق، انہیں مقامی ہندوؤں نے وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ کئی سال بعد، میرے 7ویں دادا ناتھا جمعہ موتن اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان کے جیت پور میں آ گئے۔ وہ کمیونٹی کے معاملات میں سرگرم تھے اور غالباً اس وقت جیت پور میمن ایسوسی ایشن میں کسی عہدے پر فائز تھے۔ یحییٰ ہاشم باوانی نے ۔اپنی کتاب مائی جیت پور میں ان کا نام جیت پور کے ایک اہم عہدہ کے حامل کے طور پر ذکر کیا ہے

ہمارے خاندان نے اس کی کنیت غالباً ناتھا جمعہ کے بیٹے غنی موتن کے زمانے میں حاصل کی۔ ہر موتن، یا موٹن جس سے آپ کا سامنا ہوتا ہے اس کا ایک ہی دادا ہوتا ہے: غنی ناتھا موتن۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کئی سالوں تک ۔میمن خاندان اپنے بیٹوں کو ہندو اور مسلم دونوں نام دیتے تھے

میرے والد نے اپنے آباؤ اجداد کی کہانیوں میں بھائی بہنوں کو جو کچھ بتایا اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ میرے والد کے دادا قاسم ایوب غنی موتن مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بہت مضبوط انسان تھے۔ ریٹائرمنٹ میں بھی وہ کنویں سے پانی کی بالٹیاں نکال کر مسجد میں تالاب بھرتے تھے۔ اس تالاب کو لوگ جب نماز کے لیے آتے تو وضو کرتے تھے۔ اس کی تین بار شادی ہوئی اور جب وہ 80 کی دہائی کے اواخر میں انتقال کر گئے تو ان کی آخری بیوی کو وراثت ملی

بد قسمتی سے میرے دادا عبدالکریم اور ان کے بھائیوں نور محمد اور شکور کو کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ سب کو اپنی زندگی شروع سے ۔شروع کرنی پڑی

میرے والد ہمیں بتاتے تھے کہ وہ میرے والد کے دادا قاسم کے ساتھ اس وقت کھیلتے تھے جب میرے والد کی عمر تقریباً 4 یا 5 سال تھی۔ میرے والد صاحب کو یاد ہے کہ ان کے دادا جب نماز کے لیے وضو کرتے تھے تو ان کے چہرے پر پانی چھڑکتے تھے اور ان سے کہتے تھے: "موتانریا مستان،" "تیرے لمبے لمبے کان،" "تیری ماں پکائی تیرا باپ مسلمان"۔

میرے دادا عبدالکریم نے بھی اپنی زندگی میں تین بار شادی کی۔ ان کی پہلی بیوی سے ان کا ایک لڑکا تھا جس کا نام موسیٰ اور ایک لڑکی تھی جس کا نام حنیفہ تھا۔ ولادت کے دوران بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ، ایسا لگتا ہے کہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، حالانکہ ہم نہیں جانتے کہ آیا اس نے اس وجہ سے اسے طلاق دی تھی۔ اپنی تیسری بیوی سے، عبدالکریم کے کئی بچے تھے، چار لڑکے اور دو لڑکیاں - غلام، رابعہ، عثمان، محمد (میرے والد)، حلیمہ اور عمر۔ غلام اپنی ابتدائی زندگی میں بہت بیمار ہو گیا اور سننے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس معذوری کے نتیجے میں وہ کبھی بولنا نہیں سیکھ سکا۔ رابعہ کی شادی نوعمری میں ہی ستار سلیمان موتن سے ہوئی تھی۔ ان کے چھ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ عثمان کے نو بچے تھے۔ محمد (میرے والد) کے دس بچے تھے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔ حلیمہ 17 سال کی عمر میں ٹی بی کی بیماری میں مبتلا ہوئیں اور اسی بیماری سے انتقال کر گئیں۔ چوتھا لڑکا عمر کا انتقال ہو گیا جب وہ بہت چھوٹا تھا۔

محمد (میرے والد) کے دس بچے تھے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں، ترتیب میں انور، اشرف، منور، صمد، گل بانو (جس نے اپنا نام عائشہ رکھ لیا)، یاسمین، نسرین، حسینہ، ابراہیم اور محمودہ۔

# CHAPTER 4

## نانی کا خاندان

۔میرے نانا تار محمدحاجی احمد اسحاق میانور اور میرے دادا ماموں پھوپھی کے بچے ہونے کے ناطے پہلے کزن تھے

نانا 1900میں پیدا ہوئے اور 1960 میں انتقال کر گئے۔ ان کے

بھائی - ہاشم، تار محمد، شکور، ولی، سلیمان، ابراہیم اور ایک اور جن کا نام میں یاد نہیں کر سکتا - اور دو بہنیں، امی فوئی اور ایک اورجس کا نام بھی مجھے یاد نہیں۔ میرے نانا کی شادی1915 میں عائشہ احمد خان میانور (اندھا) سے ہوئی جب ان کی ۔عمر 15 سال تھی اور عائشہ کی عمر 13 سال تھی

میری نانی عائشہ 1902 میں پیدا ہوئیں اور ان کا انتقال 1974 میں ہوا۔ ان کے چار بھائی تھے۔ لطیف، شکور، ابراہیم اور ۔سلیمان۔ اور دو بہنیں، بچپن میں ہی فوت ہو گئیں

میری والدہ اپنے والدین کی شادی کے 14ویں سال دسمبر 1929 میں پیدا ہوئیں اور انہیں کھوٹ جی (جس کا مطلب ۔خاص ہے) کہا جاتا تھا۔ ماں کی شادی میرے والد محمد عبدالکریم موتن سے مارچ 1953 میں ہوئی تھی

دوسرا بچہ، ایک بیٹا غفار، 1932 میں پیدا ہوا۔ تیسرا بچہ، ایک بیٹا مجید، 1934 میں پیدا ہوا۔ چوتھا بچہ، ایک بیٹا یونس، 1936 میں پیدا ہوا۔ پانچواں بچہ، ایک بیٹا عارف 1940میں پیدا ہوا۔ چھٹا بچہ، ایک بیٹی زرینہ، 1942 میں پیدا ہوئی۔آخری ۔بچہ، ایک بیٹا رؤف، 1947 میں پیدا ہوا

میرے نانا اور نانی نے 1947 میں جیت پور میں اپنے نئے گھر کی تعمیر مکمل کی۔ اسی دوران 14 اگست 1947 کو پاکستان بنا۔ ہندوستان چھوڑ کر مسلم اکثریتی پاکستان میں منتقل ہونے کا فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ جب 1951 میں حالات خراب ہوئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ منتقل ہونے کی تیاری شروع کر دیں۔ مقامی وکیلوں میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ ملکیت ثابت کرنے کے لیے گھر کی تصاویر کھینچی جائیں تاکہ وہ معاوضے کے لیے پاکستانی حکومت سے رجوع کر سکیں۔ ٹھیک ہے، یہ معاوضہ شہر میں دو بیڈ روم کا فلیٹ خریدنے کے لیے بھی کافی نہیں تھا۔ جیت پور میں ان کے خوبصورت گھر کی کچھ تصویریں میرے پاس ابھی بھی ہیں۔ ایک تصویر پر میرے نانا کا نام لکھا ہوا تھا۔ فوٹوشاپ کی مدد سے میں اس کو وسعت دینے میں کامیاب رہا۔ گجراتی میں لکھا ہے "تار محمد حاجی احمد میانور 1947۔"

# CHAPTER 5

## 1965 TO 1972

موسم گرما 1965 کا ہمیشہ کی طرح گرم تھا۔ کچھ دوستوں نے بی ایم بی اسکول جانے کا فیصلہ کیا تھا، جب کہ کچھ علاقے کے کسی دوسرے اسکول میں جانے کا سوچ رہے تھے۔ پانچویں جماعت کے دو کلاس فیلوز، عبدالستار اور توفیق احمد نے اردو میڈیم اسکولوں میں سے ایک میں درخواست دی۔ انہیں 7ویں جماعت میں داخل کرایا گیا تھا، اس لیے وہ چھٹی جماعت کو مکمل طور پر چھوڑنے کے قابل تھے۔ یہ میرے ذہن میں آیا کہ آگے جانے کے لیے گریڈ چھوڑنا ہی راستہ تھا۔ تو ۔میں نے تلاش کرنے کا فیصلہ کیا

اردو اسکول کے محل وقوع کی تحقیقات کے لیے۔ یہ اسکول، جس میں گرمیوں کی بہت کم کلاسیں چل رہی تھیں، تبت سینٹر کے سامنے واقع تھا۔ اگر آپ ایم اے جناح روڈ پر مشرق کی طرف ایک میل کا سفر۔ کریں۔ سعید منزل سے سکول ۔آپ کے دائیں طرف ہوتا۔ وہاں پہنچ کر، مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ اسکول میں مزید کچھ نہیں ہے

مقابلے میں لکڑی کی جھونپڑی لگتا ہے۔ کسی بھی وقت ٹوٹنے والا ہے۔ کم سے کم کہنے کے لئے متاثر نہیں، میں آخرکار بی ۔ایم بی اسکول کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس وقت نہیں جانتا تھا کہ میں اپنی زندگی کا بہترین فیصلہ کر رہا ہوں

بی ایم بی اسکول میں ہماری کلاسیں اگست 1965 میں شروع ہوئیں۔ ہمارے جنرل سیکرٹری جناب عبدالرحمٰن چھاپرا اور ہیڈ ماسٹر افسر حسین تھے۔ مسٹر افسر حسین نے بوائز سیکشن چلایا جبکہ مس ریاض مجید گرلز سکول کی پرنسپل تھیں۔ ۔لڑکیوں کے لیے صبح کے سیشن چلائے گئے جبکہ لڑکوں کے سیشن دوپہر کو چلائے گئے

ہمارے کلاس روم (ہوم روم) کے استاد شروع میں قمر الدین احمد قادری تھے، جو تاریخ پڑھاتے تھے۔ امجد علی، جو کہ حال ہی میں ہندوستان سے آئے تھے،انھوں نے سماجی علوم کا تہذیبی حصہ پڑھایا۔ تمام لڑکوں کو 12:45 بجے کے قریب

اسکول میں آنے کی اجازت دی گئی، جب لڑکیاں 12:30 بجے دوسرے گیٹ سے چلی گئیں۔ کلاس میں اپنی کتابیں یا بیگ چھوڑنے کے بعد ہم اسکول کے گراؤنڈ میں جمع ہو جاتے تھے جہاں ایک طالب علم قرآن پاک کی تلاوت سے شروع ہوتا تھا، اس کے بعد اس دن کی حدیث اور اسلامیات کا کوئی استاد اس کا ترجمہ کرتا تھا۔ اسمبلی سے منتشر ہوتے ہی ہم مس مجید کے دفتر کے سامنے ایک لمبی گلی کی طرف چل پڑتے جہاں ہم نماز ظہر ادا کرنے کے لیے جمع ہوتے۔ اعلیٰ طبقے کا ایک طالب علم رضاکارانہ طور پر کام کرتا، عام طور پر جمیل احمد (میمن) ظہر کی اذان کے لیے۔ نماز کے فوراً بعد کلاسز شروع ہو جاتیں۔ ہر کلاس 30 منٹ طویل تھی۔ ایک گھنٹی اگلی مدت کے آغاز کا اشارہ دیتی۔ اسکول ہر حصے کے لیے (جیسا کہ میں نے کہا ہے، صبح لڑکیاں اور دوپہر کو لڑکے) تقریباً چار گھنٹے تک چلایا جاتا تھا۔ ہم کلاسوں کے بعد گھر کے لئے نہیں نکلتے تھے، مغرب کی نماز تک یا کبھی کبھی عشاء کی نماز تک کھیل کود کو ترجیح دیتے تھے۔ ہماری سرگرمیوں میں باسکٹ بال، فیلڈ ہاکی، والی بال اور بیڈمنٹن شامل تھے۔

ہم نے نئے اسکول میں بہت سے نئے دوست بنائے، اور، آج تک، ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور سوشل میڈیا پر رابطے میں رہتے ہیں۔ بی ایم بی اسکول کا معیار جے ایم اے اسکول کے معیار سے بہت زیادہ اچھا تھا۔ ہم نے اپنے ماہانہ ٹیسٹ کے دوران محسوس کیا کہ یہاں مقابلہ بہت بلند سطح پر ہوگا۔ فائنل امتحان کے بعد کلاس میں میرا رینک پانچویں نمبر پر تھا۔ بدقسمتی سے، اسکول سے ہمارے بہت سے دوست ناکام ہوگئے اور اسی سال اسکول چھوڑ دیا۔ میرے والد نے ہم دونوں بھائیوں کو سکاؤٹ ٹیم کے ایک حصے کے طور پر کوئٹہ جانے کی اجازت دی۔ کوئٹہ صوبہ سرحد کا ایک بڑا قصبہ تھا جو افغانستان کی سرحد کے بالکل قریب تھا۔ ہمارے اسکول کی طرف سے یہ سفر ترتیب دیا گیا، سفر کا خرچہ 85 روپے فی شخص تھا۔ ان دنوں یہ بہت کم رقم تھی، اور مجھے یقین ہے کہ میرے والد نے ہمیں ہمارے سفر سے انکار کرنے کی بجائے اسکول کی ادائیگی کے لیے کچھ ادھار لیا تھا۔ ہمارے عربی استاد غفور صاحب اور ہمارے قرآن کے استاد قاری ضیاءالدین صاحب نے ہمیں 10 سے 12 بچوں کو سفر پر لے جانے کا بوجھ اٹھایا۔ یہ دو ہفتوں کا سفر ہونا تھا لیکن ایسا لگا جیسے ہم سالوں سے گھر سے دور ہیں۔ میرے والد نے ہم دونوں کو ہمارے دو کیری بیڈ (بستروں کے اندر کپڑوں کے ساتھ) کے ساتھ دیا۔ جب تمام بچے آچکے تو ہم اسکول بس میں سوار ہوئے اور ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔

ٹرین اس دوپہر کو کوئٹہ کی طرف روانہ ہوئی۔ دونوں اساتذہ نے ہمارے کھانے اور چائے کا انتظام کرنے میں بڑی مشقت لی تھی۔ انہوں نے کھانا پکایا اور ہمیں گرم چائے سمیت رات کا کھانا اور ناشتہ پیش کیا۔ یہ ٹرین کا پہلا سفر تھا، اس لیے ہم صرف یہ سیکھ رہے تھے کہ کوئٹہ ریلوے اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے 24 گھنٹے کیسے بیٹھنا ہے۔ جب ہم آخر کار پہنچے تو غفور سر کے والد اور ان کے کچھ کارکن ہمیں لینے کے لیے وہاں موجود تھے۔ ایک بار جب ہم غفور سر کے والدین کے گھر پہنچے تو ہمیں ایک اچھا کھانا پیش کیا گیا جس سے ہم نے بہت لطف اٹھایا۔ اس کے بعد ہم سب کو گھر سے باہر کوارٹرز میں منتقل کر دیا گیا، جہاں ہم نے اپنے بستر اور کپڑے لگانے شروع کر دیے۔ ہم نماز فجر کے بعد نماز پڑھنے اور صبح سویرے ورزش کرنے میں وقت کے بہت پابند تھے۔ عام طور پر، صبح 8 بجے کے بعد، ہم مقامات کو دیکھنے کے لیے شہر جاتے تھے۔ اس وقت کوئٹہ ایک چھوٹا سا شہر تھا لیکن ہم سواریوں اور کھانے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ دو دن بعد ہم چمن اور شیخ واصل کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ دونوں جگہیں افغانستان کی سرحد کے قریب تھیں۔ جب ہم شیخ واصل پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر ٹھہرے اور رات وہیں سو گئے۔ اگلی صبح خوشگوار گزری اور ہم نے اپنے ناشتے کا لطف اٹھایا، جب کہ غفور سر کے بڑے بھائی نے ایک پہاڑی بکرا پکڑا اور اسے ہمارے دوپہر اور رات کے کھانے کے لیے ذبح کیا۔

ہمارا آخری سفر زیارت کا تھا، جہاں ہم نے اس گھر کا دورہ کیا جس میں قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے آخری ایام گزارے تھے۔

جب ہم واپس آئے تو ہمارے والدین ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہمارا کچھ وزن کم ہو گیا ہے اور شاید یہ سچ تھا۔ ہم سفپر پر ہونے کے بعد ماں کے ھاتھ کے کھانے کو چکھنے کے لیے مشکل سے انتظار کر سکتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ پہلا کھانا تھا جس کا ہم نے دو ہفتے قبل سفر پر روانہ ہونے کے بعد سے واقعی لطف اٹھایا تھا۔

اب ہم ساتویں جماعت میں تھے اور ہم سکول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میرے والد اسکول کی فیس برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے، اس لیے مجھے پاکستان میمن ویلفیئر سوسائٹی کو درخواست دینے کو کہا گیا۔انہوں نے میری اسکالرشپ کی منظوری دے دی۔یہ سمجھ کر کہ میں بڑا ہو کرپوری رقم واپس کر دوں گا۔ تاکہ دوسر آنے والے بچوں کو فائدہ ہو سکے۔ ہرچند دنوں بعد جناب عبدالرحمان چھاپرا صاحب طبقاتی مقابلے پر یقین رکھتے تھے۔ جب بھی یہ مقابلہ طے ہوتا تھا، ہمارے اسکول کے کچھ کارکن وقفہ شروع ہونے سے پہلے چھٹی ساتویں آٹھویں نویں اور دسویں جماعتوں کے پارٹیشنز کو نکالنا شروع

کر دیتے۔ اس تنظیم نو نے ہم سب کو مقابلے میں حصہ لینے کے لیے ایک بڑی جگہ فراہم کی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بہت سے انگریزی الفاظ کے ہجے درست کرنے پر جیتا تھا اور مجھے ایک اچھی کتاب سے نوازا گیا تھا۔ ان مقابلوں میں سے ایک اسلامی علم سے متعلق تھا، جس میں ہم سے قرآن و حدیث سمیت دین سے متعلق بہت سے سوالات پوچھے گئے۔ ہمارے کلاس فیلو، سلیم چھاپرا پہلے نمبر پر رہے، اور میرا صرف ایک سوال غلط ہوا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا: "قال فما خطبکم" سے شروع ہونے والا قرآن کا کون سا باب ہے؟ تھا ستائسواں باب۔

اسی سال 1967 میں میرے والد صاحب ہم دونوں بھائیوں کو ایک ماہر امراض چشم ڈاکٹر کے پاس لے گئے جو میرے چچا ڈاکٹر احمد موتن کے دوست تھے۔ ہمارے والد صاحب سے کئی سالوں کی شکایت کے بعد یہ پہلا سفر تھا، جنہوں نے آخر کار ہمارے انکل ڈاکٹر احمد کے لیکچر کی وجہ سے ہماری بات سنی۔ جب ہمیں آپٹومیٹرسٹ نے انتہائی شدید مایوپیا، یا بصارت سے محرومی کی تشخیص کی تھی۔ ہماری تعداد اتنی زیادہ تھی کہ جب ہم نے اپنی نئی عینک لگائی تو ایسا لگا جیسے پہلی بار اللہ کی مخلوق کا حسن دیکھا۔ ہم یقیناً پرجوش اور انتہائی خوش تھے۔

اب جب کہ ہم کلاس میں توجہ مرکوز کرنے کے قابل تھے، میں 7ویں جماعت میں چوتھے نمبر پر آیا اور 8ویں جماعت میں چلا گیا۔

آٹھویں جماعت کا نصاب بہت مشکل تھا، لیکن اب کم از کم ہمارے پاس عینک تھی اور بورڈ پر واضح طور پر دیکھنے کے قابل تھے کہ ہمارے استاد کیا لکھ رہے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے پاس بہت سارے مضامین تھے۔ مجھے تاریخ اور جغرافیہ سے نفرت تھی۔ ہمیں یہ ثابت کرنے کے لیے ماہانہ ٹیسٹ دینا پڑتا تھا کہ ہم مضامین کی اچھی سمجھ رکھتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں ٹیسٹ کے دوران اپنے نوٹ کھلے رکھوں تو میں بہتر کر سکتا ہوں۔ جب میں اپنے نوٹوں سے نقل کرتے ہوئے پکڑا گیا تو استاد بہت پریشان ہوئے۔ اس نے مجھے اس جرم پر ڈانٹا لیکن خوش قسمتی سے مجھے ناکام نہیں کیا۔ ہلکی سزا کے باوجود میں نے اس واقعے سے دھوکہ دہی کے بارے میں بہت بڑا سبق سیکھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہی بچے جنہوں نے استاد کو اطلاع دی تھی، وہ میرے گھر ریاضی کی تعلیم کے لیے آنے لگے۔ میں نے کبھی نہیں منع کیا۔اس سال ہمارے پی ٹی آئی ٹیچر نے ہمیں گرمیوں میں آرمی سوئمنگ پول میں لے جانے کا وعدہ کیا۔

جیسے ہی ہمارا فائنل ختم ہوا، ہم نے تیراکی سیکھنے کے لیے تیراکی کا یہ سفر شروع کیا۔ ہم دونوں بھائی بہت جلد سیکھ گئے۔ ایک بار جب میرے والد ہمارے ساتھ سفر کے لیے شامل ہوئے تو وہ ہماری کارکردگی سے بہت متاثر ہوئے۔ دکھاوے کے لیے، میں نے چھ فٹ پانی میں ایک اچھا غوطہ لگایا لیکن فلیٹ سے باہر آنے کی بجائے سیدھا اوپر آیا تاکہ میں فری اسٹائل کر سکوں اور آگے بڑھ سکوں۔ زمان سر نے دیکھا اور میری مدد کے لیے قدم بڑھانا چاہا لیکن میرے والد نے انہیں روک دیا۔ اس کی وجہ سے، یقینی طور پر، میں نے اپنے طور پر سیکھا کہ کس طرح اپنے سر کو سطح سے اوپر رکھنے کے لیے پانی کو روند کر زندہ رہنا ہے۔

ایک دن ہمارے تیراکی کے سفر کے دوران جب میں باہر کھڑا دوستوں سے باتیں کر رہا تھا تو ہمارے کلاس ٹیچر سر امجد علی نے سب کو بتاتے ہوئے میری تعریف شروع کر دی کہ میں نے اپنے فائنل امتحانات میں کتنی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ میں اپنے کلاس ٹیچر سے ملنے والی تعریف سے بہت خوش تھا۔ جب نتائج کا اعلان ہوا تو میں کلاس میں پہلے نمبر پر آیا۔ یہ میرے اسکول کیریئر میں ایک قابل ذکر کامیابی تھی۔

جب ہم نے آٹھویں جماعت مکمل کی تو مجھے اپنے دوستوں اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ لاہور جانے کی اجازت مل گئی۔ مجھے 100 روپے دیئے گئے، جبکہ دیگر اخراجات اس وقت میرے دوست توفیق فاضل کے والد جناب احمد فاضل نے سنبھالا تھا۔ یہ توفیق اور محمود کے گھر والے تھے جنہوں نے اپنی مرضی سے ہمیں ایک اور دوست سلیم ستار کے ساتھ جانے کی اجازت دی۔ ہم کراچی کینٹ ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہوئے۔ 24 گھنٹے میں ہم لاہور ٹرین سٹیشن پر پہنچے، جہاں احمد بھائی اپنے باورچی اسلم اور ایک اور ساتھی کے ساتھ ہمیں لینے ریلوے سٹیشن آئے۔ احمد بھائی باوانی گروپ آف انڈسٹریز کے لیے کام کر رہے تھے اور انھیں لاہور میں باوانی کے لیے پنجاب کے کاروبار کا انتظام سونپا گیا تھا۔ شاہ عالم مارکیٹ میں ان کا ایک اچھا فلیٹ تھا، جہاں ہم چھٹیاں گزارنے جا رہے تھے۔

چونکہ میرے والد صاحب اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور، راولپنڈی اور گوجرانوالہ جاتے تھے، اس لیے انہوں نے لاہور میں جانے کے لیے پہلے ہی چند مقامات تجویز کیے تھے۔ ان میں انار کلی، مغل شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد، سکھوں کا مندر، لاہور کا قلعہ، اور بہت سی دوسری جگہیں۔

ہر روز ہم نے ایک بہترین ناشتہ کرنا جس میں تلے ہوئے انڈے، آملیٹ، پکی ہوئی کلیجی، اور گرم روٹیاں شامل تھیں، اس کے ساتھ ایک گرم چائے بھی شامل تھی۔ ہم صبح نو بجے کے قریب احمد بھائی اور مریم بائی (توفیق اور محمود کی والدہ) کے ساتھ نیچے بازار میں خریداری کے لیے نکلتے۔ ایک اچھے دوپہر کے کھانے کے بعد، ہم عصر کی نماز کے بعد پھر سے باہر روانہ ہوتے تھے اور کچھ تجویز کردہ جگھوں پر جاتے تھے۔ ایک دن ہم نے احمد بھائی سے پوچھا کہ کیا ہم راولپنڈی اور مری جا سکتے ہیں؟ انھوں نے راولپنڈی میں اپنے دوست سے رابطہ کیا، اور ہمارے لیے باورچی اسلم کے ساتھ پنڈی روانہ ہونے کا سفر طے پا گیا۔ ہم نے ٹرین کا سفر راولپنڈی تک لیا اور رات وہیں رہے۔ راولپنڈی میں واقعی دیکھنے کو کچھ نہیں تھا، اس لیے ہم اگلے دن جلد ہی مری کے لیے روانہ ہو گئے۔ راولپنڈی سے مری تک بس کے سفر میں صرف چند گھنٹے لگے اور ہم دوپہر کے قریب پہنچے۔ سمجھ میں آیا کہ شام تک مری کی پہاڑیاں دیکھیں اور شام کی بس میں واپس راولپنڈی آگئے۔ مری انتہائی خوبصورت پہاڑیوں سے بھرا ہوا ہے، اور جولائی اور اگست کے دوران موسم اچھا اور سرد ہوتا ہے۔

جب ہم مری کے بڑے بازار میں ونڈو شاپنگ کر رہے تھے تو میں اپنے قرآن کے استاد قاری ضیاء الدین کے پاس جا پہنچا، جو اپنے طلباء کے ساتھ شمالی پاکستان کے دورے پر تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے طالب علموں سے نہایت احترام کے ساتھ متعارف کرایا اور بتایا کہ میں نے ان کے ایک عربی شو میں کتنا اچھا کام کیا تھا، اپنے آپ کو بادشاہ کے سامنے کچھ ذہین جوابات کے ساتھ پیش کیا۔

ہمیں بس سٹیشن پہنچنے میں دیر تھی، لیکن خوش قسمتی سے، ہم نے راولپنڈی کے لیے روانہ ہونے والی آخری بس نہیں چھوڑی۔ سفر سے بہت تھکے ہوئے تھے، دیر سے کھانا کھا کر ہم سو گئے۔ لاہور کے لیے ہماری ٹرین دوپہر کے آخر میں تھی، اس لیے ہم تھوڑی دیر سے اٹھے، ناشتہ کیا، اور ٹرین اسٹیشن کے لیے روانہ ہونے کی تیاری کی۔ ایک بار پھر، ہم رات گئے لاہور پہنچے اور شاہ عالم مارکیٹ تانگہ (گھوڑا گاڑی) لے کر پہنچ گئے۔

لاہور میں احمد بھائی کے ایک دوست نے ہمیں کھانے پر بلایا تھا۔ یہ شریف آدمی، (میں اب اس کا نام بھول گیا ہوں) لاہور کے نواح میں ایک خوبصورت کوٹھی (محل جیسا گھر) تھا۔ ہم نے رات کے کھانے کا لطف اٹھایا، جس میں لاہور کی سگنیچر ڈش لسی (چینی کے ساتھ دودھ اور دہی کا امتزاج) اور یقیناً رات کے کھانے کے اختتام پر سویٹ ڈش شامل تھی۔

اب جب کہ لاہور کے پسندیدہ مقامات کی تمام سیر مکمل ہو چکی تھی اور ہم نے کافی تصاویر بھی کھینچ لی تھیں، ہم شام کو باورچی اسلم کے ساتھ انار کلی بازار جانے لگے۔ انار کلی میں لسی اور آم کے مشروبات کی کچھ اچھی دکانیں ہیں، اور ہم نے ان سب کا نمونہ لیا۔

اب روانگی کی تیاری کا وقت تھا۔احمد بھائی میری انتظامی مہارتیں دیکھتے ہوئے کہ میں نے ایک ڈائری رکھی ہے میری بات سے بہت متاثر ہوئے۔ چونکہ میں نوٹ لینے کے ساتھ ساتھ سونے سے پہلے دن کی سرگرمیاں بھی لکھ لیتا تھا۔ انھوں نے مجھے سامان کی تعداد اور اقسام کی فہرست بنانے اور لاہور اسٹیشن سے نکلنے سے پہلے اور کراچی پہنچنے کے بعد یہ یقینی بنانے کا کام سونپا کہ گنتی ٹھیک ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ساری محنت کے بعد میں نے اپنی ڈائری ٹرین اسٹیشن جانے سے پہلے فلیٹ میں چھوڑ دی۔ احمد بھائی نے بہت مہربانی سے میری ڈائری بذریعہ بک پوسٹ بھیجی، جو مجھے بہت دنوں کے بعد موصول ہوئی۔ احمد بھائی نے میرے اخراجات کا پرچہ بھی تیار کر کے مجھے دیا۔ میرے والد نے مجھے مریم بائی کو واپس کرنے کے لیے رقم دی، اور مجھ سے کہا کہ میں اپنے بیٹے کی طرح میری دیکھ بھال کرنے کے لیے ان کا بہت شکریہ ادا کروں۔

میں نے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کے لیے چند کھلونے خریدے تھے۔ ان میں ایک ٹرین تھی جو میں نے اپنے بھائی ابراہیم کے لیے خریدی تھی، جسے ہم سب مل کر کھیلتے تھے۔

سفر سے ہم نے جو تصویریں تیار کی تھیں ان میں سے بہت ساری اچھی نکلیں، اور وہ میرے پاس آج تک موجود ہیں۔

واپس آنے کے بعد، ہم نے جسمانی تندرستی والی جگہ (بھولو کا اکھاڑہ) جانے کے لیے اپنا شیڈول ایڈجسٹ کیا۔

ہفتے میں فجر کی نماز کے بعد کثرت سے اس اکھاڑے میں جاتے تھے۔ سپروائزر ایک میمن تھا جو ہر وقت اپنی باڈی بنانے میں مصروف رہتا تھا۔ لیکن وہ ہمیں اپنے جسم کو درست رکھنے کے لیے ورزش کے کچھ اچھے پروگرام سکھاتا تھا۔

اب شاید خوابوں کی دنیا میں گھومتا رہتا ہوں۔ کبھی ماں باپ کے ساتھ ان کی عجیب و غریب باتیں سنتا رہتا ہوں تو کبھی امی سے ضد کر کے دوآنے نکلواتا کیونکہ نانی کے گھر کے نکڑ پر ایک مٹھائی والا ہوتا جس سے میں ایک میٹھا سموسہ خرید لیتا۔

کبھی میں شام کی ٹھنڈی ہوآؤں میں تاج محل مارکٹ سے گزرتا ہوا حاجرہ بائی منزل پہنچ جاتا جہاں میرے دوست میرا انتظار کر رہے ہوتے ۔ لیکن ایک جھلک کیلئے چھت پر چڑھ کر انتظار کرتا کہ وہ اب ایک نظر چھت پر ڈالے گی ۔

کچھ اسکے پاؤں کی آہٹ بھی ہے دھڑکن جیسی

کچھ میرا ذوقِ سماعت بھی بہک جاتا ہے

راہِ وفا میں لٹا کر متاع قلب و جگر

کیا ہے تیری محبت کا حق ادا میں نے

یہ سیر اور تفریح کچھ زیادہ کر نے لگا ہوں جس میں اکثر نانی کی گلی میں کرکٹ یا سور پالہ کھیل رہاُہوتا ہوں

جب میں نے 9ویں جماعت شروع کی، تو میں نے یہ سمجھا کہ میں

اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے لیکن میں نے مطالعہ پر زیادہ توجہ نہی دی۔ میں پیار میں تھا اور اس لڑکی کے ساتھ رشتہ شروع کرنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرنا شروع کر دیا۔ میں صبح اپنی بہنوں کو اسکول لے جانے لگا کہ وہ لڑکی بھی آئے گی۔

۔انتظار کرو جب تک وہ ظاہر نہ ہو. میرا اندازہ ہے کہ ان دنوں صرف آنکھ کا رابطہ کافی سے زیادہ تھا

میں نے ہندوستانی موسیقی سننا شروع کی اور اپنی ماں اور ایک چچا کو راضی کیا کہ وہ ہمیں ایک ریڈیو خریدیں تاکہ ہم آکاشوانی ریڈیو اسٹیشن سن سکیں۔ خوش قسمتی سے، جس جگہ ہم رہتے تھے، وہاں مارواڑیوں کی بڑی آبادی گلی میں بڑے بڑے اسپیکروں پر ہندوستانی موسیقی بجاتے تھے۔ ہم نے بھی یہ گانے سننے کے قابل سمجھے۔ آج بھی، مجھے 1969 سے 1973 کے وہ گانے بہت پسند ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یکطرفہ محبت میں رہنا میرے اندر اس قدر رومانوی احساس پیدا کرتا ہے کہ زندگی شاندار اور خوبصورت تھی۔

ہمارے نویں جماعت کے پہلے بورڈ کے امتحان کے نتائج کا اعلان ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ میں نے 59٪ نمبر حاصل کیے، جو کسی بھی معیار کے لحاظ سے بہت اچھے نہیں تھے، لیکن انجینئر بننے کی خواہش رکھنے والے کے لیے یہ ایک جاگنے والی کال تھی۔ کلاس کے ایک طالب علم، اسلم سورتی، جو کہ پانچ بہترین طالب علموں میں سے ایک نہیں تھا، نے ٹاپ سکور حاصل کیا۔ میں نے اور میرے بھائی نے اس کے ساتھ دسویں جماعت میں پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے دسویں جماعت کے آغاز کے دوران بہت محنت کی یہاں تک کہ یہ 1970 میں ختم ہو گئی۔ تقریباً، ہم دونوں بھائی روزانہ کیپری سینما کے قریب ان کے گھر پیدل جاتے تھے اور کم از کم 2 سے 3 گھنٹے مضامین پر پڑھتے تھے۔ ہمیں پتہ چلا کہ اسلم کے والد، غلام سورتی، اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے ریاستوں کا دورہ کرتے تھے۔ زیادہ تر وقت اس کے والد اسلم کے ساتھ انگریزی میں ہی گفتگو کرتے۔ میں ریاضی میں اچھا تھا، اس لیے میں ریاضی پڑھاتا، جبکہ اسلم ہمارے ساتھ انگریزی گرامر کا جائزہ لیتا۔ میں نے دوسرے مضامین جیسے کیمسٹری اور فزکس پر بھی توجہ دینا شروع کر دی۔ چونکہ میں سائنس کا طالب علم تھا اس لیے ہمیں ٹائپنگ کے اسباق لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میں نے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کے اسباق بھی لینا شروع کر دیے۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں ایک دن امریکہ چلا۔ گیا تو میں عجیب و غریب کام کرنے کے بجائے ٹائپسٹ یا سٹینو گرافر کے طور پر کام کر سکتا ہوں۔

فائنل امتحانات ختم ہو چکے تھے اور میرے والد دونوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے کہ ہم دونوں بھائی کچھ کام ڈھونڈ لیں۔ مجھے کلرک ٹائپسٹ میرے چچا مامو مجید تار کے ساتھ، جونور سلک ملز کے جنرل منیجر تھے کام مل گیا۔دفاتر میری ویدر ٹاور کے قریب واقع تھے۔ میں نے وہاں اپنا کام ہفتے کے دنوں میں صبح 9:00 بجے سے شام 5 بجے تک شروع کیا۔میں نے اسی بس کو بندرروڈ پر لینا شروع کیا۔ وہی سڑک جسے میرے والد اپنے کام پر جانے میں لیا کرتے تھے۔ اب بھی، بس اسٹاپ ہمیشہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ میرے والد نے ہم سب کو ایک بہتر زندگی دینے کے لیے اپنی زندگی میں کتنی محنت کی تھی۔

مجید ماموں نے مجھے برآمدی دستاویزات ترتیب دینے کی بہت سی مختلف ضروریات سکھانا شروع کیں اور مجھے بانڈ پیپر پر ٹائپ کرنے کی ترغیب دی۔ ویسے، اس بانڈ پیپر کی لاگت 10 روپے سے لے کر 100 روپے تک تھی، جو کہ دستاویز کے موضوع پر منحصر ہے۔ اگر آپ ٹائپنگ میں خرابی کرتے ہیں تو یہ کمپنی کے لیے مالی نقصان ہوگا۔ میں بہت محتاط تھا اور بہت جلد درست طریقے سے ٹائپ کرنا سیکھ گیا۔

ہمارے میٹرک کے نتائج کا اعلان ایک دوپہر کو ہوا، اور میں فرسٹ ڈویژن میں درج ہو گیا۔ میرے ماموں بہت خوش تھے، اور انہوں نے فوراً ایک ساتھی کو کچھ مٹھائیاں خریدنے کے لیے بھیجا۔ ہم نے مٹھائی کے ساتھ اچھی گرم چائے پی اور اس شام کا لطف اٹھایا۔

ایک دن جب ایک ورکر نے بیمار ہو کر فون کیا تو میرے مامو نے مجھ سے دوسرے آفس ورکرز کے لیے چائے منگوانے کو کہا۔ میں نیچے ایک اچھے ریستوراں میں گیا اور عملے کے لیے چائے کا آرڈر دیا۔ اس وقت مجھے قریبی سٹال پر فروخت ہونے والی باقاعدہ چائے اور ریستوران سے خریدی گئی چائے کے درمیان قیمت کا فرق محسوس نہیں ہوا۔ کہانی کو مختصر کرنے کے لیے، میں نے اس دن سیکھا کہ ہمیں اپنے وسائل کے اندر رہنا چاہیے۔ اسی شام، میرے ماموں مجھے کمپنی کے مالک حاجی نور سے ملنے لے گئے۔ وہ کپڑا بازار میں اپنی کپڑے کی دکان پر بیٹھا کرتے تھے جو دفتر کی عمارت سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ماموں اسے مہنگی چائے کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے لے گئے تھے۔

مہینے کے آخر میں، میرے والد، جو میری تنخواہ کے منتظر تھے، اس موضوع پر میری ماموں سے رابطہ کیا۔ میرے ماموں نے کہا کہ میں جو کچھ کر رہا تھا وہ صرف رضاکارانہ کام تھا، ایک طرح کی بلا معاوضہ انٹرن شپ۔ میرے والد بہت پریشان تھے، اور اگلے دن، ہم فاروق ٹیکسٹائل ملز میں ان کے باس، مسٹر غلام احمد اسماعیل سے ملنے گئے۔ ان کا دفتر جوبلی ہاؤس میں تھا جو میکلوڈ روڈ پر واقع تھا جو اب چندریگر روڈ ہے۔ جناب اسماعیل نے مجھے شیئر ہولڈرز کے دفتر میں رکھا، جسے نظام نامی ایک شخص چلاتا تھا، جہاں مجھے شیئر ہولڈرز کے شیئر سرٹیفکیٹ ٹائپ کرنے کا کام سونپا گیا۔ میرے فرسٹ کزن زکریا موتن نے ابھی اسی کمپنی میں بطور ایکسپورٹ مینیجر جوائن کیا تھا۔ ان کی میز اسی بڑے ہال میں تھی، جہاں مجھے ایک ڈیسک تفویض کیا گیا تھا۔ اس سے میں نے اچھے دفتری اخلاقیات میں اپنا پہلا سبق حاصل کیا۔ وہ ایک شاندار شخص تھے، جس کی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس نے ہم سب بھائیوں کو اسکول میں ہمیشہ رہنمائی فراہم کی۔ دفتر میں کافی کے وقفے کے دوران، کبھی کبھی وہ مجھے اور میرے مینیجر نظام کو لے باہر ریسٹورانٹ میں لے جہاں ہم چائے پیتے اور گوشت کی پیٹیز کھاتے۔

مہینہ تیزی سے ختم ہو گیا تھا، اور مجھے ایک میری خدمات کے لیے 125 روپے تنخواہ موصول ہوئی۔

اگلے دن، میں اسکول گیااور میٹرک کی مارک شیٹ لے آیااللہ کا شکر ہے کہ میرے نمبر اچھے تھے۔ اور میں نے ریاضی میں 94٪ اسکور کیے، میرا پسندیدہ مضمون، لیکن میرے ہیڈ ماسٹر نے مجھے بتایا کہ اشرف ستار نے سب سے زیادہ گریڈ حاصل کیا، ایک شاندار 95٪۔ فوری طور پر، میں نے ڈی جے میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا۔ سائنس کالج۔ انجینئرنگ کالج کے ۔لیے خود کو تیار کرنے کے لیے یہ ایک بہترین سائنس کالج تھا

میرا خواب ڈی جے سائنس کالج، میں شرکت کرنا تھا۔ لیکن ہمیں بہت سے لوگوں نے بتایا تھا کہ مارک شیٹ پر 620 سے ۔کم والے کسی کو داخلہ نہیں دیا جائے گا

ہم جانتے تھے کہ ڈی جے سائنس کالج مقابلہ میں بہترین کھلاڑیوں کو قبول کرے گا۔یراکی، ٹیبل ٹینس، فیلڈ ہاکی اور کرکٹ۔ ہم دونوں بڑے بھائی تیراکی میں اچھے تھے، اس لیے ہم نے موقع لینے کا فیصلہ کیا اور سوئمنگ ٹیم کے انتخاب کے عمل میں شرکت کی۔ مقابلے میں مختلف سکولوں کے طلباء نے شرکت کی۔ ہم دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی منتخب ۔نہیں ہوا۔ بی وی ایس پارسی اسکول کے صرف تین طلبہ نے فائنل کیا

اگست 1970 کے اواخر میں، میں ڈی جے سائنس کالج میں داخلے کے لیے درخواست دینے گیا۔ وہاں ایک بڑی لائن تھی، اور طلباء کو ان کے مارک شیٹ کے اسکور کی بنیاد پر بلایا گیا تھا۔ کال 710 اور نیچے سے شروع ہوئی۔ میرا ٹوٹل 609 تھا۔ اشرف ستار موتی والا اور میں دونوں اپنے نمبروں کے انتظار میں لائن میں تھے۔ مجھے اس کا صحیح کل نمبر یاد نہیں ہے لیکن یہ میرے جیسی ہی حد میں تھا۔ اس دوپہر کے بعد ہمارے نمبروں پر کال کی گئی۔ ہم دونوں کے علاوہ ایک اور ۔طالب علم کو بھی بلایا گیا، غلام عباس پیارعلی عناصر۔ بعد میں عباس ہمارے اچھے دوستوں میں شامل ہو گئے

انھیں دنوں میری سب سے چھوٹی بہن محمودہ نے بی ایم بی ٹوڈلر اسکول شروع کیا جو میرے کالج کے راستے میں تھا۔ میں نے محمودہ اور اپنے بھائی ابراہیم، جو میری بہن سے ایک سال بڑا تھا، دونوں کو اپنے کالج کے راستے پر بی ایم بی ٹوڈلر اسکول میں چھوڑنا شروع کیا۔ کالج عام اسکولوں سے بالکل مختلف تھا۔ گھر کے کمرے کے بجائے ہمیں کیمپس میں مختلف کلاسوں تک بھاگنا پڑتا تھا۔ کچھ انتہائی سمجھدار اساتذہ تھے جو پڑھانے کے معاملے میں بہت نظریاتی تھے۔ میں اس قسم کی تعلیم کا عادی نہیں تھا لیکن اس سے محبت کرتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے کے دوران، اشرف ستار اور میں

دونوں ایک چھوٹے سے اسٹال پر چلے جاتے جہاں سے ہم لنچ کے لیے کچھ سینڈوچ اور ایک کوک خریدتے۔ دوپہر عام طور پر فزکس اور کیمسٹری لیب سیشن کے لیے ہوتی تھی۔ میں اکثر ان سیشنز کو چھوڑ دیتا تھا۔

کالج میں اس سال کے دوران، ہم نے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میرے والد کے دوست یونس موتن نے ہمیں امریکہ جانے کی تیاری کرنے کا کہا تاکہ ہم اچھے پیسے کما سکیں اور اپنے والدین کی مدد کر سکیں۔ ایک دن یونس موتن کے چھوٹے بھائی عبداللہ موتن امریکہ سے دورے پر واپس کراچی آئے۔ اس وقت وہ فلوریڈا کے شہر میامی میں مقیم تھے۔ ہم ایک دن اپنے والد کے ساتھ برنس روڈ کے قریب ان کے اپارٹمنٹ میں ان سے ملنے گئے۔ وہ ہم سے چند سال بڑا تھا اور اس نے امریکی اسکولوں میں داخلے کے لیے درخواست دینے کے بارے میں کچھ اچھے تاثرات فراہم کیے تھے۔ اس سے کچھ کام کرنے کا موقع بھی ملے گا تاکہ ہم کچھ پیسے کما سکیں۔ اس کے لیے اس نے ملازمتوں کی کچھ تربیت تجویز کی۔ اس نے جن ملازمتوں کا ذکر کیا ان میں سے ایک لیتھ مشین آپریٹر تھی۔ میرے والد صاحب اپنے ایک کلائنٹ سے رابطہ کر سکے جو لارنس روڈ پر اقبال انجینئرنگ ورکشاپ کا مالک تھا۔

اس پہلے سال کے دوران، کالج میں پڑھنے کے علاوہ، میں بحریہ کے سوئمنگ پول میں تیراکی کرتا تھا۔ ویک اینڈ کے دوران ہم دونوں بھائی اقبال انجینئرنگ میں لیتھ مشین چلانے کا طریقہ بھی سیکھ رہے تھے۔

اس دوران میں نے اپنے پاسپورٹ کے لیے بھی درخواست دے دی۔ درخواست کو مکمل کرنا آسان تھا اور لاگت کم سے کم تھی، بین الاقوامی پاسپورٹ کے لیے 25 روپے۔ ضرورت صرف یہ تھی کہ درخواست فارم پر کسی اعلیٰ حکام کے دستخط ہوں۔

میرے ایک کلاس فیلو کے والد بحریہ کے اعلیٰ افسر تھے۔ میری درخواست پر اس کے والد نے میرے لیے فارم پر دستخط کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ ایک دوپہر میں اس سے ملنے گیا۔ اس وقت وہ سوسائٹی میں رہ رہے تھے۔

جب میں نے سعید منزل سے پی ای سی ایچ ایس جانے کے لیے بس پکڑی تو وہ بھری ہوئی تھی، اور میں بمشکل بس کے دروازے پر لٹک سکا تھا۔ صدر میں ایک موڑ کے دوران، بس گھوڑا گاڑی کے قریب بھی جا لگی اور ایک بڑی کیل میری پیٹھ پر کھرچ گئی۔ اللہ کا شکر ہے، میں ایک پھٹی ہوئی قمیض کے علاوہ زخمی نہیں ہوا۔ خیر، میں اس حالت میں اپنے دوست

کے گھر نہیں جا سکتا تھا، اس لیے مجھے پہلے گھر جا کر اپنی قمیض بدلنی پڑی۔ دوسری کوشش میں بالآخر میں بحفاظت اس جگہ پہنچ گیا۔ پی ای سی ایچ ایس میں بس سے اترنے کے بعد، اور چند لوگوں سے ہدایات پوچھنے کے بعد، مجھے صحیح گھر کی طرف اشارہ کیا گیا۔ میرے دوست اور اس کے والد بہت مہربان تھے اور انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ میرے والدین واقعی خوش تھے کہ میں اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال رہا ہوں، لیکن انہیں بس میں ہونے والے واقعے پر تشویش تھی۔ یہ بات سمجھ میں آتی تھی کیونکہ میں زندگی میں دوسری بار موت کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ پہلی بار میری زندگی کے پہلے سال کے دوران ہوا، جب مجھے اسہال کا شدید کیس ہوا اور میرے والدین میرے بچنے کی امید کھو چکے تھے۔

اگلے دن، خضرہ مسجد کے قریب، میں اپنے پاسپورٹ کے لیے درخواست دینے کے لیے لائن میں کھڑا تھا۔ لائن لمبی تھی، لیکن میں کھڑکی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے فارم پر لگانے کے لیے 25 روپے کا ڈاک ٹکٹ خریدا تھا اور اسی وقت اپنا دستاویز جمع کرا سکتا تھا۔

اچانک، ایک آدمی یہ وعدہ کرتا ہوا نمودار ہوا کہ وہ میری دستاویز میرے لیے جمع کرائے گا۔ بے دلی سے میں نے اس کی پیشکش کو مان لیا اور اسے اپنا فارم دینے کے بعد گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اگلے دن جب میں دفتر واپس آیا تو کلرک نے میرا ریکارڈ نکالا اور کہا کہ فارم میں 25 روپے کا ڈاک ٹکٹ غائب ہے۔ اس نے کہا کہ ڈاک ٹکٹ کے بغیر وہ میری درخواست پر کارروائی جاری نہیں رکھ سکتا۔ میں بہت افسردہ ہوا اور اس آدمی کو تلاش کرنے لگا۔ آخر کار میں نے اسے ڈھونڈ لیا، لیکن، بہت سے بہانے بنانے کے بعد، وہ آدمی مجھے دھوکہ دے کر فرار ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے ڈھونڈتا، کلرک نے مجھے خبردار کیا تھا کہ کچھ لوگ قابل بھروسہ نہیں ہیں اور مجھے محتاط رہنا چاہیے۔ لیکن کلرک کا مشورہ ظاہر ہے بہت دیر سے آیا تھا۔

بہرحال گھر پہنچ کر میں نے اپنے والد کو بتایا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ بالکل پریشان نہیں تھے، اور کہا کہ یہ واقعہ میرے لیے سیکھنے کا تجربہ تھا۔ میں اس وقت جانتا تھا کہ 25 روپے بھی کھونے کے لیے بہت بڑی رقم ہے۔ والد صاحب نے مجھے مزید 25 روپے دیئے۔ میں نے اگلے دن اپنی درخواست جمع کرائی، اس بار اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ فارم پر ڈاک ٹکٹ چسپاں کیا گیا تھا۔

کچھ شام بعد ایک پولیس کانسٹیبل میرے پتے، نام اور تاریخ پیدائش کی تصدیق کرنے آیا۔ میرے کچھ پڑوسی میرے ساتھ گئے اور گواہوں کے طور پر دستخط کئے۔

پاسپورٹ پک اپ کی تاریخ کے ساتھ ایک رسید دی گئی اور اس دن میرا پاسپورٹ لینے چلا گیا۔ بالکل درست، کلرک نے میرا پاسپورٹ مجھے دے دیا۔ میں نے امریکہ کے سفر پر پہلا قدم اٹھایا تھا۔

میں نے ان میں سے ایک طالب علم کو دیکھا جس میں قاسم سورتی کو داخل کیا گیا تھا۔ وہ کالج تعلیمی میرٹ پر نہیں بلکہ ٹیبل ٹینس میں بہترین کھلاڑی تھا جس کی وجہ سے اسے داخلہ ملا۔

قاسم اورمیں ایک ساتھ گھومنے لگے۔ بدقسمتی سے، میں نے

تمباکو نوشی کی۔ شام کو، ہم دونوں امریکہ کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے درخواستیں ٹائپ کرنے میں مصروف تھے۔

میں اپنی کالج کی پڑھائی پر مشکل سے دھیان دے رہا تھا، یہ سوچ کر کہ چونکہ میں جلد ہی امریکہ چلا جاؤں گا، اس لیے اپنی پڑھائی ختم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے کالج کے پہلے سال کے نتائج تباہ کن تھے۔ میں نے دوسری ڈویژن حاصل کی تھی، پہلی ڈویژن میں صرف 2 پوائنٹس کی کمی تھی۔

مجھے پتہ چلا کہ دوسرے دوست امین فطانی اور اشرف مجید بھی امریکہ میں کالجوں کے لیے اپلائی کر رہے تھے۔ اشرف کا بڑا بھائی عارف مجید (محسن) پہلے ہی ہیوسٹن میں تھا جہاں کی بیپٹسٹ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ آخرکار، وہ دن آگیا جب میں نے کالج سے اپنا پہلا داخلہ حاصل کیا۔ اگلے دن، میں اپنے انگریزی ٹیسٹ کے لیے درخواست دینے کراچی میں امریکی سفارت خانے میں تھا۔ کالج کی ضرورت کے مطابق امتحان پاس کرنے کے بعد، مجھے ویزا کے لیے درخواست دی گئی۔

میرے والد نے آرام باغ کے قریب ایک چھوٹے سے علاقے میں اپارٹمنٹ خریدنے کے لیے کچھ رقم جمع کرائی تھی۔ رنچھور لائنزمیں جس ایک کمرے کا گھر ہم رہ رہے تھے وہ یقینی طور پر دس بچوں اور دو بالغوں کے لیے اتنا بڑا نہیں تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں نے امریکی کالج کے لیے اپنی تمام ضروریات پوری کر لی ہیں اور میرا سمسٹر جنوری 1972 میں شکاگو میں

شروع ہو گا، تو اس نے ٹکٹ خریدنے کے لیے مجھے اپنی زندگی کے وقت کی بچت دینے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنی گھر کے .۔لئے رقم واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ ٹیوشن اور تبادلے کے لئے ادائیگی رقم کافی تھی

کسی نہ کسی وجہ سے پاکستان کے حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو پہلے ہی مغربی پاکستان میں الیکشن جیت چکے تھے، جب کہ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمان واضح فاتح تھے۔ لیکن بھٹو کے پاس ویسٹ ونگ میں کافی مقبول ووٹ تھے اور انہوں نے پاکستان کے وزیر اعظم بننے کا فیصلہ کیا۔ مغربی پاکستانی، جو

مسلح افواج کی اکثریت پر مشتمل، بنگالیوں پر دونوں بازو کی نمائندگی کے لیے بھروسہ نہیں کیا۔ بھارت نے طاقت کے ساتھ مداخلت کی اور مغربی پاکستان نے بھارت کے ساتھ ساتھ مشرقی ونگ میں اپنے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ جنگ کی۔ یہ جنگ جلد ہی پاکستان کی ذلت آمیز شکست پر ختم ہوئی جس نے نیا ملک بنگلہ دیش بنایا۔ 94 ہزار مسلح افواج کے اہلکار بھارتی قیدی بن گئے۔ سی او ایس، لیفٹیننٹ جنرل یحییٰ خان نے اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کیا، جو ویسٹ ونگ کے وزیر .اعظم بنے، اس کا نام بدل کر اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھ دیا

اپنی کالج کی پڑھائی میں دلچسپی ختم کرنے کے بعد، میں جانتا تھا کہ اگر میں امریکہ کے لیے نہیں جاتا تو میں ناکام ہو جاؤں گا۔ میں نے پہلے ہی کالج سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے گرمیوں کی مدت کے لیے جاری کرے۔ میں نے اپنا داخلہ ایک اپریل 1972 کے آخر میں حاصل کیا، اور کوئی وقت ضائع کیے بغیر، میں دوبارہ امریکی سفارت خانے میں I-20 بار پھر طالب علم ویزا کے لیے اپنی درخواست جمع کروا رہا تھا۔ میرے ماموں مجید نے مجھے پہلے ہی اپنے ذریعہ سے بینک گارنٹی کی .دستاویز فراہم کی تھی اور میرے والد نے ٹکٹ خریدنے اور ٹیوشن کی ادائیگی کے لیے 8,500 روپے کا تعاون کیا

میرا انٹرویو اس شام ڈاکٹر تھور نے کیا، جو فلوریڈا کی میامی یونیورسٹی کے ڈین بھی تھی۔ دوبارہ، مجھے سفارت خانے سے ایک ہفتے کے بعد اپنا پاسپورٹ لینے کی رسید دی گئی۔ میں بہت پرجوش تھا اور اس اقدام کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ میرا دوست امین گل (فطانی) کافی خوش قسمت تھا کہ اس کا ویزا بہت پہلے مل گیا تھا اور وہ پہلے ہی شکاگو کے لیے روانہ ہو چکا تھا، اسی جگہ میں جانے کا سوچ رہا تھا۔ اشرف مجید کو اپنے ٹرپ کے فنانسنگ میں کچھ مسائل تھے اس لیے ہم دونوں اب سمر .ٹرم کے لیے پلان کر رہے تھے

# CHAPTER 6

## 1972TO1985

جنگ ختم ہو چکی تھی اور وہ لوگ جنہیں مسلح افواج نے تیار کیا تھا کالج واپس آ چکے تھے۔ میں پہلے ہی کراچی میں امریکی حاصل کرنے کا انتظار کر I-20 سفارت خانے میں اپنا ای پی ٹی ٹیسٹ دے چکا تھا اور 1972 کے موسم گرما کے لیے رہا تھا، کیونکہ میں پہلے ہی موسم بہار کا سیشن چھوڑ چکا تھا، اس لیے میں امریکی ویزا کے لیے درخواست دے سکتا تھا۔ میرے پاس ایک بین الاقوامی پاسپورٹ تھا، اور والد صاحب نے فیملی کے لیے آرام باغ کے قریب ایک اور اپارٹمنٹ میں ۔جانے کے لیے کافی بچت کی تھی، جس کی قیمت وہ پہلے ادا کر چکے تھے

الیکشن کئی مہینے گزر چکے تھے۔ مشرقی پاکستان چلا گیا، اس کی جگہ ایک نیا ملک بنگلہ دیش نے لے لیا۔ اسکولوں کو نیشنالائزکر لیا گیا، اور طلباء کی ایک پوری نسل ضائع ہو گئی۔ اردو لازمی زبان بن گئی جبکہ نجی اسکولوں میں انگریزی نایاب ہوگئی۔ میں نے کالج چھوڑنا شروع کر دیا اور میرے دوسرے سال کے فائنل امتحان کی تیاری کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ ۔تاہم، میں نے ایڈمٹ کارڈ کی ادائیگی کا انتظام کیا اور اس دوسرے سال کے لیے اپنا اندراج نمبر حاصل کیا

پہلی مئی کو میں اپنا پاسپورٹ لینے امریکی سفارت خانے گیا۔ میں نے رسید کھڑکی پر موجود کلرک کے حوالے کی تو وہ ایک منٹ کے لیے واپس چلا گیا اور ایک لفظ کہے بغیر میرا پاسپورٹ لے کر واپس آگیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اپنے ویزا کے لیے مسترد کر دیا گیا ہو گا، لیکن جب میں نے اپنا پاسپورٹ کھولا تو وہاں یہ تھا، امریکہ کا چار سال کا ملٹیپل اسٹوڈنٹ ویزا۔ اچانک، یہ ایک خوبصورت دن تھا، اور میں بہت خوش تھا. میرے پاس امریکہ جانے کے لیے والد کی طرف سے ویزا اور کافی ۔رقم تھی

جب میں اپنے پاسپورٹ میں امریکی ویزا لے کر گھر آیا تو میرے والد صاحب خوش لیکن کچھ افسردہ نظر آئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جب سے پاکستانی کرنسی کی قدر میں کمی ہوئی ہے، امریکہ جانے کی لاگت دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ وہ اب مجھے بھیجنے کا متحمل نہیں تھے۔ یہ سن کر میں بہت گھبرا گیا اور انتہائی افسردہ ہوا کیونکہ میں نہ صرف انٹر سائنس (12ویں کلاس) کے فائنل امتحانات کی تیاری کر رہا تھا بلکہ کراچی میں نوکری تلاش کرنے کا بھی سامنا تھا۔

میرے کزن کے بھائی اور ہمارے خاندان کے سب سے قابل اعتماد افراد میں سے ایک زکریا موتن نے جب میری حالت سنی تو انھوں نے اگلے دن مجھ سے ملنے کو کہا۔ میں انھیں فنلے ہاؤس میں دیکھنے گیا تھا، جہاں ہم نے اپنے پہلے کام گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران ایک ساتھ کام کیا تھا۔

انھوں نے مجھ سے اپنے ایک دوست سردار محمد سے ملنے کو کہا، جو کراچی میں قالین کے ایک بہت مشہور تاجر تھے جس . سے وہ پہلے ہی میرے حالات پر بات کر چکے تھے۔

میں انھیں لیاقت اور موتنڈاس مارکیٹ کے قریب دیکھنے گیا۔ ہماری میٹنگ میں، میں نے انھیں بہت ہی قبول کرنے والا اور شریف آدمی پایا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ زکریا بھائی سے میرے حالات پر بات کر چکے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے پاس کچھ فنڈز تھے جو ان کے والد نے مجھ جیسے طلباء کی مدد اور مدد کے لیے بہت پہلے ترتیب دیے تھے جو امریکہ میں پیشہ ورانہ کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ مزید تفصیلات میں جانے کے بغیر، اس نے اپنے کیشئر کو 10,000 روپے نکالنے کی ہدایت کی اور پھر روپے میرے ہاتھ میں رکھ دیے۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے کیونکہ میں نے ایک وقت میں چند روپے سے زیادہ نہیں دیکھے تھے۔ پھر انھوں نے 5 یا 10 روپے کا نوٹ نکالا اور مجھ سے کہا کہ رکشہ لے کر سیدھا گھر جانا یقینی بنائیں۔

جب میں گھر پہنچا، تو میں نے اپنے والد کو شاندار خبر سنائی، اور ہم دونوں، ہمارے حوصلے بلند ہوئے، فوری طور پر اپنا زرمبادلہ اور شکاگو کا ٹکٹ لینے کے لیے روانہ ہوگئے۔ فیصلہ ہوا کہ میں 26 مئی 1972 کو روانہ ہو جاؤں گا۔

تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ اس رات میرے پانچوں ماموں میرے گھر پر تھے۔ یہ ایک بہت بڑا خاندانی اجتماع تھا جس میں زکریا بھائی کی فیملی بھی شامل تھی۔ کوئی نہیں سویا، اور میری ماں ساری رات روتی رہی۔ میرے والد کو اس بات پر فخر تھا

کہ وہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھیجنے میں کامیاب ہوئے، لیکن وہ مجھے سردار صاحب کے قرض کے بارے میں یاد دلاتے رہے۔ ان کے مطابق میری پہلی ترجیح کام تلاش کرنا اور خاندان کی مدد کرنا تھا۔ ہم اپنی جلد پرواز کرنے کے لیے ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہونے کے لیے بہت جلد اٹھے۔ غفار ماموں نے مجھے اپنے پتلون میں بیلٹ ڈالنے اور نیکٹائی باندھنے کا طریقہ سکھایا۔ سردار صاحب نے ہم سب کو ایئرپورٹ لے جانے کے لیے دو گاڑیوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہوائی اڈے کے راستے میں، مجھے تمام جوش و خروش سے متلی آ گئی۔ غفار مامو نے ایک دواخانے میں ڈرائیور کو روکا اور میرے لیے .دوائیاں لے کر آئے۔ اسے لینے کے بعد، میں نے تھوڑا بہتر محسوس کیا

ان دنوں میں، سب کو ہوائی اڈے کے اندر جانے کی اجازت تھی، اور مجھے میرے خاندان کی طرف سے شاہی رخصت دیا گیا، جن میں سے سبھی مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ مجید ماموں کو بہت فخر تھا کہ اس نے مجھے پہننے کے لیے ایک اچھی گھڑی دی۔ ہم نے اپنی ساری زندگی ایک ہی اسکول کے لباس اور ایک جوڑے میں گزاری تھی، اس لیے یہ اشارہ تقریباً بہت زیادہ ہینڈل کرنے کے لیے تھا۔ جیسے ہی فلائٹ روانہ ہوئی، پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ میں آنے والے کئی سالوں تک اپنے ۔خاندان کو نہیں دیکھ سکوں گا

۔مجھے یقین دلایا گیا کہ میرے دوست امین کو ٹیلیگرام بھیجا گیا ہے

یہ پی آئی اے کی پرواز ہونے کی وجہ سے ہر چند گھنٹے بعد مختلف ممالک میں رکتی رہی۔ کچھ ممالک ہمیں جہاز سے اترنے ۔اور اپنے ہوائی اڈے پر گھومنے کی اجازت دیتے رہے

قاہرہ سے، ایتھنز، فرینکفرٹ، نیویارک تک۔ ہم نیویارک میں دیر سے پہنچے، اس لیے میری شکاگو کی فلائٹ چھوٹ گئی۔ جب ہم امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہوئے تو میں ایمانداری سے اتنا تھک گیا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم ابھی شکاگو نہیں پہنچے تھے۔ بہرحال، میں اور میرے ساتھی مسافر ہمیں پی آئی اے کے کاؤنٹر پر لے گئے، جہاں ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم سب صبح سویرے کی فلائٹ میں بک کر چکے ہیں اور ہم ایئرپورٹ کے کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہوٹل ۔کسی بھی معیار کے لحاظ سے پرانا تھا اور کمرہ چھوٹا تھا، لیکن یہ میرے لیے جنت جیسا تھا جو رنچھوڑ لائنز سے کہیں بہتر تھا

ان دنوں رابطہ بہت مشکل تھا۔ کوئی ای میل یا انٹرنیٹ سروس نہیں تھی۔ میں نے ایک نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی جو مجھے ابو بکر اسماعیل نے دیا تھا۔ کوئی جواب نہیں تھا، اور امین فطانی کے پاس اس وقت کوئی فون نہیں تھا۔ اب میں اللہ کے رحم و کرم پر تھا کہ وہ مجھے صحیح جگہ پر لے آئے۔ خوش قسمتی سے، جب ہم شکاگو کے لیے ہوائی جہاز میں سوار ہوئے، میرے ساتھ بیٹھے مسافروں میں سے ایک شکاگو کے کوک کاؤنٹی ہسپتال کا معالج تھا۔ وہ پاکستان کے شہر لاہور میں اپنے اہل خانہ سے ملنے کے بعد واپس آرہے تھے۔ میں نے انھیں اپنی کہانی سنائی اور احسان مندی سے، اس نے اپنی منزل تک پہنچنے میں میری مدد کی۔ جیسے ہی ہم اترے، ہم نے 2 ویسٹ شکاگو ایونیو کے ایک معلوم پتے پر ٹیکسی لی، جہاں امین رہتا تھا۔

اپارٹمنٹ کی عمارت اسٹیٹ اسٹریٹ اور شکاگو ایونیو کے کونے میں تھی۔ جیسے ہی ہم منزل پر پہنچے، میں باہر نکلا اور دروازہ کھولنے کے لیے عمارت کی طرف چل پڑا، جب کہ ڈاکٹر ٹیکسی میں انتظار کر رہا تھا۔ یقیناً، دروازہ بند تھا، اور مجھے کہا گیا کہ چھوٹے کیفے ٹیریا میں جاؤں اور مالک سے کہوں کہ وہ مجھے اندر آنے دیں۔ میں یہاں تھا، گھر سے 9000 میل دور اور میری مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ مایوسی کے عالم میں، میں نے نیچے سے امین کو پکارا، بہت سے امریکی میری طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی نٹ کیس ہوں۔ خدا کا شکر ہے، آخر کار میں نے کھڑکیوں میں سے ایک سے سر باہر نکلتے دیکھا۔ "میں امین ہوں، تم کیا چاہتے ہو؟" آدمی نے کہا. یہ امین موتن تھے جو بعد میں اچھے دوست بھی بن گئے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں امین فطانی کو ڈھونڈ رہا ہوں اور اس نے کہا کہ وہ اسے مل جائے گا۔ امین فطانی فوراً نیچے تھا۔ میں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے کیب ڈرائیور کو ادائیگی کرنے کی کوشش کی، لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے، وہ ویسے بھی کوک کاؤنٹی ہسپتال جا رہا تھا۔

مجھے اپارٹمنٹ نمبر 105 میں لے جایا گیا، جس پر امین اور اس کے کچھ دوست تھے، جن سے امین نے میرا تعارف کرایا۔ یہ امریکہ میں میری زندگی کا آغاز تھا۔ تمام روم میٹس کے لیے، اتوار کا دن ایک خاص دن تھا، کیونکہ یہ اسکول اور کام سے چھٹی کا دن تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد، امین اور ان کے دوست منیر مجھے میک کارمک تھیٹرانڈین فلم دیکھنے کے لیے لے گئے۔

مجھے بتایا گیا کہ دوپہر 3 بجے وہ پرانی فلم داغ چلا رہے تھے جس میں دلیپ کمار تھے اور شام 6 بجے گمنام، جس میں اس وقت ایک ہندوستانی کامیڈین محمود تھے۔ میری درخواست پر فیصلہ کیا گیا کہ ہم دونوں شوز کے لیے جائیں گے۔ جیسے ہی ہم تھیٹر میں داخل ہوئے، میں 1969 اور 1970 کے ہندوستانی گانے سن سکتا تھا۔ وہ کراچی میں میرے گھر کی یادیں واپس لے آئے۔ محلے کے ماروا ڑی چھوٹے چھوٹے موقعوں پر بھی ہندوستانی گانے بجاتے۔ فلم جینے کی راہ سے، مجھے یاد ہے:

آنے سے اسکے آئے بہار

جانے سے اسے جائے بہار

بڑی مستانی ہے میری محبوبہ

میری زندگی ہے میری محبوبہ

آنے سے اس کے آئے بہار

جانے سے اسے جائے بہار

بڑی مستانی ہے میری محبوبہ

میری زندگی ہے میری محبوبہ

یہ پہلی دو ہندوستانی فلمیں تھیں جن سے میں نے لطف اٹھایا۔ اگلے دن، میموریل ڈے، پیر، 29 مئی، 1972 کو، ایک روم میٹ، حلیم، مجھے لیک شور ڈرائیو پر لے گیا جہاں ہم نے شکاگو کی اپنی پہلی تصاویر لیں۔

جب ہم واپس آئے تو امین کو میرے چچا مجید ماموں کی طرف سے بھیجا گیا ایک ٹیلیگرام موصول ہوا جس میں امین کو میری آمد کی تاریخ اور وقت بتایا گیا تھا۔ بہت دیر ہو گئی کیونکہ میں پہلے سے ہی وہاں تھا لیکن، اس پر کلک ہوا کہ میں نے ابھی تک اپنے والدین کو اپنی محفوظ آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ چنانچہ ہم نے ایک ٹیلی گرام بھیجا، اور میں نے ایروگرام میں اپنی آمد اور امین کے ساتھ رہنے کے بارے میں ایک خط بھی لکھا۔

ایک اور روم میٹ ممتاز نے مجھے بتایا کہ اس کا باس پلے بوائے ریسٹورنٹ کے کیفے ٹیریا میں مدد کی تلاش میں تھا۔ بولی ہونے کی وجہ سے، مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ جگہ کیا ہے لیکن اسکول شروع ہونے سے پہلے کام کے لیے پرجوش تھا۔ تو، میری مختصر چھٹی

۔اس کے بعد، میں نے اس کیفے ٹیریا میں بس بوائے کے طور پر کام کرنا شروع کیا

ممتاز، ایک بہت ہی شفیق آدمی، نے مجھے کام کے بارے میں سکھایا، اور گھر میں، اس نے مجھے کھانا پکانا سکھایا۔ وہ مجھے اپنا سوشل سیکورٹی کارڈ حاصل کرنے کے لیے بھی لے گیا، جو اس وقت کرنا آسان تھا۔ سوشل سیکورٹی آفس کے کلرک نے میری درخواست لی اور میرا پہلا سوشل سیکورٹی کارڈ ٹائپ کیا، جو آج بھی میرے پاس ہے۔ میں اب امریکہ میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لیے تیار تھا۔ ایک ہفتہ کام کرنے کے بعد، محکمہ نے مجھے بلایا۔ جب انہوں نے میرے کام کا مطالبہ کیا۔ پرمٹ یا گرین کارڈ، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ اسی رات امین نے مجھے بتایا جان ہینکاک سنٹر کی 95ویں منزل پر پینٹری مین کا ایک عہدہ کھلا تھا، جہاں امین بھی کام کر رہے تھے۔ ممتاز کو بتائے بغیر میں نے جان ہینکوک میں 2 ڈالر اور 50 سینٹ فی گھنٹہ کی اچھی ۔ابتدائی تنخواہ کے ساتھ نوکری لے لی۔ ممتاز واقعی غصے میں تھا کیونکہ اسے کیفے ٹیریا کی ساری شفٹ خود ہی کھینچنی تھی

سمر اسکول میں، میں نے چھ کریڈٹ گھنٹے لئے اور دوپہر 3 بجے سے آدھی رات تک کام کرنا۔ میرا روز مرہ کے معمولات میں ۔ایک سادہ ناشتے کے بعد صبح میں اسکول کے لیے جلدی جانا شامل تھا

۔وائی ایم سی اے کالج صرف دو میل دورتھا سیدھا اسٹیٹ اسٹریٹ پر واقع دائیں طرف اور اسکول بائیں طرف تھا

واپسی کے بعد ایک بجے کے قریب اسکول سے، میں نے اپنا لنچ تیار کرنا ہوتا تھا۔دوپہر کے کھانے کے بعد، میں تقریباً 3 بجے کام کے لیے روانہ ہو جاتا اور عام طور پر آدھی رات تک واپس آ جاتا۔ میں نے یہ معمول پانچ دن دہرایا، بشمول ہفتہ۔ اتوار کو ۔میں کام اور اسکول دونوں سے چھٹی کرتا تھا، اور ہفتے کے ایک دن میں کام سے رخصت ہوتا تھا

سمر سیشن ختم ہوتے ہی ہمیں اشرف مجید کا فون آیا۔ وہ استنبول میں پھنس گیا تھا اور چاہتا تھا کہ ہم امریکہ واپس جانے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدیں۔ امین نے ٹکٹ خرید کر اسے بھیج دیا۔ دو دنوں میں اشرف شکاگو میں تھا۔ منیر کے دو اور

دوست شبیر اور اقبال (پاک پینٹر کا بیٹا) آئے اور ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ اب ہم چھوٹے اپارٹمنٹ کے لیے بہت زیادہ تھے۔

امین اور منیر نے مجھے بتایا کہ ہمیں کچھ فرنشڈ اپارٹمنٹس میں جانا پڑ سکتا ہے کیونکہ 2 ویسٹ شکاگو ایونیو رہنے کے لیے خطرناک جگہ بنتا جا رہا ہے۔ وہاں مقیم بہت سے پاکستانی پی آئی اے اور پاکستانی جہازوں کے ذریعے غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہوئے تھے۔ اگرچہ ہم قانونی تھے، چار سالہ ایف ون اسٹوڈنٹ ویزا رکھتے تھے، اور اسکولوں میں جا رہے تھے، اگر امیگریشن نے اس علاقے پر چھاپہ مارا تو ہم سب مشکلات میں پڑ جائیں گے۔ چنانچہ ہم 1117 نارتھ ڈیئربورن چلے گئے۔ فیصلہ ہوا کہ امین، اشرف اور میں وہاں چلے جائیں۔ا

میں، غلام عباس (ڈی جے سائنس کالج کے دوست) اور اشرف ایک اپارٹمنٹ لیں گے، جبکہ منیر، شبیر، اقبال، اور ٹونی (تبو بلوچ) دوسرا اپارٹمنٹ لیں گے۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنا کرایہ اور گروسری پورا کرنے کے لیے امین کو 100 ڈالر ادا کرتے تھے۔ اگر وہ کسی بھی مہینے میں زیادہ آیا تو ہم فرق بھر دیتے تھے۔ ہر ہفتے سے میری خالص تنخواہ تقریباً 95 ڈالر تھی۔ میں نے اپنے والدین کو قرض ادا کرنے کے لیے باقاعدگی سے 100 سے 150 ڈالر بھیجنا شروع کیے اور ساتھ ہی ان کے لیے ایک بہتر گھر خریدنے کے لیے کچھ رقم بچائی۔ میں ہر سمسٹر میں ٹیوشن ادا کرنے کے لیے پیسے بھی بچا رہا تھا۔ میں نے اپنے کالج کو ختم کرنے کا مکمل ارادہ کیا اور کبھی بھی اسکول نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

اگست 1972 کے اوائل میں جب ہم سکول کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو برفباری شروع ہو گئی۔ یہ میری پہلی برف تھی، اور ہم نے بہت مزہ کیا۔ چند دنوں کے بعد برف باری کے باعث سڑکوں پر برف بننا شروع ہو گی ،اب یہ نہیں رکے گی، اور درجہ حرارت ناقابل برداشت تھا۔ میں نے ٹیکساس میں ایسی یونیورسٹیوں کی تلاش شروع کی جہاں ٹیوشن مناسب تھی اور درجہ حرارت قابل برداشت تھا۔

چھٹی کے دنوں میں ہم ہندوستانی فلمیں دیکھنے، ہفتہ بھر کھانا پکانے اور ہندوستانی گانے بجانے والے ہندوستانی ریڈیو اسٹیشن کو سننے جاتے۔ کئی بار میں رو رو کر دعا کرتا کہ اللہ مجھ پر رحم کرے۔ ایک 18 سالہ نوجوان کے لیے کام کرنے، اسکول جانے اور ایک ہی وقت میں گھر کو پیسے بھیجنے کے دوران اپنے خاندان سے اتنا دور رہنا بہت مشکل تھا۔

وہاں ہر روزٹاؤن ہال اجلاس تھے جہاں ریپبلکن کے طور پر قومی انتخابات میں، رچرڈ نکسن اور سپیرو اگنیو دوڑ رہے تھے۔ اور وہاں عوام سے سوالات کے جواب دینے کے لئے دکھائیں دیتے۔

نومبر، 1972، انتخابات، رچرڈ نکسن اوراس کے رننگ ساتھی سپیرو اگنیو نے زبردست فتح حاصل کی۔ میں نے نکسن اور اگنیو کو جنوری 1973 میں اپنے عہدے کا حلف لیتے ہوئے دیکھا۔

اسی سال کا موسم گرما ہمارے لیے مزید روم میٹ لے کر آیا۔ سلیم غنی (دوگان)، رزاق اسماعیل، اور اسلم سورٹی شکاگو پہنچے۔ میں نے انجینئرنگ میں 31 گھنٹے کی تعلیم مکمل کی تھی اور ہیوسٹن، ٹیکساس میں ساؤتھ ٹیکساس جونیئر کالج سے داخلہ حاصل کیا تھا۔ میں اپنے بھائی اشرف کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے میرا بارہویں جماعت کا مارک شیٹ بھیجا۔

میں غلام باس اور رزاق اسماعیل ساتھ ٹیکساس جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔امین فطانی کو شکاگو سے باہر کے کالجوں میں سے ایک سے

اسکالرشپ ملی تھی اور وہ بھی جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ فیصلہ جلدی تھا۔ رزاق پی ای سی ایچ ایس میں اپنے ایک دوست مختار چودھری کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو اب ہیوسٹن میں تھا۔ میں نے اسکول کے لیے کافی رقم جمع کر لی تھی اور میرے والدین نے میرا قرض ادا کر دیا تھا، ساتھ ہی آدم جی نگر میں ایک اچھا اپارٹمنٹ خریدا تھا۔ رنچھور لائنز کے مقابلے اس وقت یہ بہت بہتر علاقہ تھا۔

ہیوسٹن جانے سے پہلے، ہم نے جان ہینکوک بلڈنگ کے 95 ویں منزل کے ریستوراں میں اپنے کام پر تھوڑا وقت گزارا، جہاں میں اب اپنے گاہکوں کو ہمارے فرانسیسی شیف کی ایک خاص ڈش بیف ویلنگٹن پیش کر رہا تھا۔ یہ اگست 1973 کے اختتام کے قریب تھا۔ میرے علاوہ وہاں کام کرنے والے بہت سے پاکستانیوں میں امین فطانی، اقبال (پاک پینٹرز کے بیٹے)، سلیم ادمانی، تبو بلوچ، اور دیگر شامل تھے۔ میں ان خوبصورت یادوں کو کبھی نہیں بھولوں گا۔

لفظی طور پر آسمان میں کام کرنا اور بادلوں کو تیرتے دیکھنا۔

ہیوسٹن میں ایک بار ہم چوہدری مختار کے گھر ٹھہرے جہاں ہمارا تعارف ابو بکر (للی) خان، زبیر محمود، اور امین محمود سے ہوا۔

ان نئے دوستوں نے جلدی سے نوکریاں حاصل کرنے میں ہماری مدد کی۔ میں نے بطور ایک آغاز مائیکل اینجلوس میں بس بوائے، ایک اطالوی ریستورانی کام شروع کیا۔

ایونڈیل تین سو ایک اپارٹمینٹ سے صرف ایک بلاک پر تھا۔ جہاں ہم ایک بیڈروم اپارٹمنٹ میں رہتے تھے جس کی قیمت ہم تینوں عباس، رزاق اور میرے لیے 40 ڈالر تھی۔ واحد ملا، چوہدری مختار، اور ابوبکر للی ویٹر تھے، جب کہ زبیر اور میں بس بوائے تھے۔ ہماری ڈیوٹی تھی کہ ہم میزوں سے گندے برتن اکھٹے کر کے واپس کچن میں ڈش واشر کے لیے لاتے۔ شفٹ کے اختتام پر، ویٹر اپنی تجاویز کا حساب لگاتے اور ہمیں اپنا حصہ ادا کرتے۔ ہم $1.25 فی گھنٹہ کی کم از کم اجرت بھی حاصل کر رہے تھے، جو شکاگو میں دی جانے والی اجرت سے بہت کم تھی۔

میں نے اپنی رجسٹریشن ساؤتھ ٹیکساس جونیئر کالج میں مکمل کی، جسے یونیورسٹی آف ہیوسٹن نے خریدا تھا اور اس کا نام بدل کر یونیورسٹی آف ہیوسٹن ڈاون ٹاؤن کیمپس رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے 12 گھنٹے کے لیے رجسٹر کیا، تمام اکتیس گھنٹوں وائی ایم سی اے کالج کی کریڈٹ حاصل کر کے کالج پھر سے جانا شروع کیا۔

مجھے گھر سے نکلے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا، اور میں اپنے خاندان کو یاد کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے والد صاحب سگریٹ پیتے ہوئے اس کی آواز بھی کھو چکے ہیں اور وزن بھی کم ہو گیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر احمد خان کو خط لکھا جو میرے چچا ڈاکٹر احمد موتن کے انتقال کے بعد میرے والد کے معالج تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ براہ کرم اس بات کو یقینی بنائیں کہ اسے کوئی کینسر نہیں ہے اور وہ میرے والد کو سگریٹ نوشی بند کرنے کے لیے کافی ڈرا دے۔

اسکول میں تقریباً ایک مہینے کے بعد، میں واقعی گھر واپس جانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے خاندان سے کہا کہ وہ مجھے ایک ٹیلیگرام بھیجیں جس میں لکھا ہو کہ والد بیمار ہیں اور مجھے واپس آنا چاہیے۔ چال کام کر گئی۔ میں ٹیلیگرام کو اسکول لے گیا اور فوری طور پر موسم بہار کے داخلے کی کاپی مل گئ۔ اسکول کے اس سمسٹر کے لیے ٹیوشن کی واپسی حاصل کر لی۔ اس رقم کے ذریعے میں ٹکٹ خریدنے کے لیے کافی تھی۔ ستمبر کے آخر تک میں کراچی میں تھا۔ یہ دیکھ کر بہت اچھا لگا کہ میرے خاندان کو ایک بہتر گھر میں منتقل کیا گیا ہے۔ میرے والد

بہت خوش تھے لیکن ساتھ ہی بہت پریشان تھے کہ میں نے اتنا پیسہ "ضائع" کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر احمد ۔کو میرا خط موصول ہوا ہے اور انہوں نے سگریٹ نوشی چھوڑ دی ہے

۔ سلیم چھاپرا نے ہم میں سے بہت سے لوگوں کو فیڈرل ایریا میں اپنی نئی جگہ کریم آباد کے گھر پر مدعو کیا

میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اپنے تمام بی ایم بی والوں کی ایک فہرست رکھوں گا اور ایک پرنٹ شدہ فہرست سلیم چھاپرا کو بھیجوں گا۔ ہم نے زیادہ تر معلومات اپنے دوستوں سے اکٹھی کیں۔ چونکہ میں ان دنوں کارڈز کو پنچ کرنا جانتا ۔تھا، اس لیے میں سکول میں کمپیوٹر لیب میں ان پنچڈ کارڈز سے 80/80 کی فہرست پرنٹ کر سکتا تھا

تصویروں میں ہم میں سے بیشتر ابھی بھی رابطے میں ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس چھٹی کے دوران میں اسلم مرچنٹ کے ساتھ ٹیگ کر رہا تھا، جو مجھے دن کے وقت اپنے گاہکوں سے ملنے اور شام کو دوستوں سے ملنے لے جاتا تھا۔ رمضان شروع ہو چکا تھا، اس لیے دن کے وقت ہمیں اسے آرام سے لینا پڑا۔ میں نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ اس رمضان اور عید کا خوب لطف اٹھایا۔ جب میں جانے کے لیے تیار تھا، میری سب سے چھوٹی بہن محمودہ، جو اس وقت 6 سال کی تھیں اور میری سب سے پسندیدہ تھیں، نے میری امی سے پوچھا کہ کیا انور واقعی ہمیں دوبارہ چھوڑنے والا ہے؟ اس نے میرا دل توڑ دیا۔ میں اپنے خاندان کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، لیکن پھر ایک ذمہ داری تھی جسے میں نظرانداز نہیں ۔کر سکتا تھا

اب 1974 کا سال تھا، اور میں بلاتاخیر مائیکل اینجلوس میں کام شروع کرنے کے لیے پاکستان سے واپس آیا تھا۔ پہلے ہی ۔ایک سمسٹر میں پیچھے ہو چکا تھا۔ اب میں نے اپنا پہلا سمسٹر ہیوسٹن یونیورسٹی، ڈاون ٹاؤن کالج میں پھر سے شروع کیا تھا

میرے درجات ریاضی، فزکس، کیمسٹری اور کمپیوٹر سائنس میں بہتر تھے۔ لیکن ہسٹری، انگلش اور دیگر کورسز میں بمشکل سی بنا رہا تھا۔ میں پریشان تھا کہ ہیوسٹن یونیورسٹی 2.5 گریڈ پوائنٹ اوسط سے کم قبول نہیں کرے گی۔ اس سال میں نے ۔استعمال شدہ 1966 شیوی امپالا خریدی

میں اپنی تعطیلات کے دوران گرمیوں کے دوران، ہم نے کار کے ذریعے نیویارک کا سفر کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہم ملک کے کئی شہروں اور ریاستوں کو دیکھنے کے قابل ہوئے۔ ہم نے نیویارک میں بہت سی جگہوں کا دورہ کیا۔ ان دنوں یادگاروں کو دیکھنے کا کوئی معاوضہ نہیں تھا جیسا کہ آج ہے۔

مجھے ہیوسٹن یونیورسٹی نے کمپیوٹر سائنس میں میری بیچلر ڈگری کے لیے قبول کر لیا تھا۔

ان کے شعبہ نیچرل سائنس اور میتھمیٹکس کے ذریعے۔ ڈگری کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مجھے 126 گھنٹے کا کریڈٹ درکار تھا۔ میرے سامنے بہت سخت محنت تھی، دن میں اسکول جانا پڑتا تھا اور رات کو کام کرنا پڑتا تھا۔ کمپیوٹر سائنس اور ڈیٹا پروسیسنگ کورسز میں مجھے کئی گھنٹے گزارنے کی ضرورت تھی۔

کمپیوٹر سینٹر میں ایک وقت میں۔ بیچلر کی ڈگری ختم کرکے ماسٹر کی ڈگری شروع کرنا میری جلتی خواہش تھی۔

مائیکل اینجلوس میں جہاں میں کام کر رہا تھا وہاں بہت سارے مسائل تھے۔ میں نے گروسری اسٹورز کے لیے کام کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن میں ان کے پیش کردہ کام یا مواقع سے مطمئن نہیں تھا۔ انور جمال اور ہارون کی مدد سے میں نے سیف وے کے ساتھ درخواست دینے کا فیصلہ کیا۔ انور اور ہارون دونوں نے مجھے اسٹاک مین کے کام کے لیے تیار کیا تھا۔ اس میں گروسری کے ڈبوں کو ایک خاص کٹر سے کاٹنا اور پھر ہر یونٹ پر قیمتوں کو نشان زد کرنا شامل تھا۔ اس عمل سے راحت محسوس کرتے ہوئے، ایک دن میں ویسٹ ہیمر اور بفیلو اسپیڈ وے کے کونے میں سیف وے اسٹور #904 میں گیا۔ فریڈ گیمنز، اسٹور مینیجر، ایک نائٹ اسٹاکر کی تلاش میں تھا اور اس نے جلدی سے مجھے پانچ ڈالر فی گھنٹہ پر رکھ لیا۔ میری پہلی رات کا کام 8 اکتوبر 1975 کو رات 10 بجے شروع ہوا۔ یہ کام بہت موزوں تھا، اور میں نے تھوڑا بہتر محسوس کیا۔ میں راتوں کو کام کرنے اور دن کے وقت کالج جانے کے قابل تھا۔ شروع شروع میں یہ کام بہت مشکل تھا لیکن آخر کار مجھے اس کی عادت پڑ گئی۔

یونیورسٹی آف ہیوسٹن ڈاون ٹاؤن کالج نے نیچرل سائنس اور میتھمیٹکس میں ایسوسی ایٹ کی ڈگری پیش کی۔ جیسا کہ میں نے ڈگری کی ضرورت پوری کر لی تھی، میں نے آگے بڑھ کر درخواست دی اور خوش قسمتی سے، ڈاؤن ٹاؤن کیمپس AS ان کی ڈگری حاصل کرنے والے پہلے گریجویٹوں میں شامل تھا AS سے۔

۔گریجویشن کی تقریب مئی 1976 میں منعقد ہوئی اور میرے بہت سے دوست اس تقریب میں شریک ہوئے

فریڈ گیمنز، میرے اسٹور مینیجر، بیمار ہوگئے اور ان کی جگہ لیڈی ہینکنز نے لے لی۔ جب، مجھ سے بات کرتے ہوئے، اسے معلوم ہوا کہ میں اسکول میں جا رہا ہوں اور گریجویٹ ہونے میں صرف دو سال باقی ہیں، اس نے مجھ سے (ایکسٹینڈڈ اسٹور ۔لیول سکیننگ) سسٹم کا استعمال کرتے ہوئے قیمت میں تبدیلی کے ڈاؤن لوڈ میں مدد کرنے کو کہا

۔میری تنخواہ بڑھا دی گئی، اور میں اپنے والدین کو مزید رقم بھیجنے کے قابل ہو گیا

میلوا گلبرتھ نامی خاتون۔ میرے بارے میں مزید جاننے کے بعد، اس نے مجھ سے دوستی کی۔ اب میری زندگی میں ایک بار ۔پھر ماں جیسی شخصیت تھی

ایک دن مجھے اپنے خاندان سے متعارف کرانے کے بعد، اس نے مجھے اتوار کو اپنے ساتھ چرچ میں آنے کی دعوت دی۔ چرچ میں کم از کم دو بار خدمات میں شرکت کرنے کے بعد، میں نے محسوس کیا کہ، آخر کار، عیسائی سوچ اور سمجھ اسلام کے بہت قریب ہے۔ مجھے مقدس بائبل کی ایک کاپی بھی دی گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میرے پاس کالج کی کتابوں کے علاوہ کچھ اور پڑھنے کا سوچنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ تاہم، میں نے محسوس کیا کہ اگر عیسائی صرف اسلام کا پہلا ستون ہی کہیں گے، تو یقیناً وہ انتہائی شریف النفس مسلمان شمار کیے جائیں گے۔ ان کے خیراتی کام نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ کرسمس سے پہلے، میں بے گھر لوگوں کے ساتھ ساتھ شہر کی غریب آبادیوں میں عطیہ کردہ گروسری تقسیم کرنے میں مدد ۔کرنے لگا

میرے ایک دوست حمید زکریا نے اپنی فیملی کو یہاں ہیوسٹن مدعو کیا تھا۔ ہم نے کیلیفورنیا کا سفر کرنے اور اس کے ۔والدین کو لے جانے کا فیصلہ کیا

یہ مغربی ساحل کا میرا پہلا سفر تھا۔ ان دنوں ہم میں سے اکثر کے پاس بہت پرانی کاریں تھیں، جنہیں ہم صرف اسکول . ۔جانے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے تھے

اور کام. حمید نے ابھی عملی طور پر ایک مونٹیکارلو نئی کار خریدی تھی، یہ گاڑی حیرت انگیز طور پر ہموار تھی۔ سواری فیصلہ یہ ۔تھا کہ اس گاڑی کو اپنے سفر پر لے جایا جائے۔ ڈرائیو ان دنوں مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ بہت خوبصورت تھی

ایل اے اور ڈزنی لینڈ کا دورہ کیا۔ ہمارا اگلا پڑاؤ سان فرانسسکو تھا، جہاں ہم اپنے اسکول کے دوست یاسین صالح محمد سے ملے اور ان کے ساتھ رہے۔ یہ ایک اور خوبصورت شہر تھا، جس میں خوبصورت ساحل اور گھاٹ تھے۔ آخری جگہ ہمیں رینو، نیواڈا لے گئی، جہاں ہم نے حسین اور ان کی اہلیہ سے ملنے کے لیے کچھ دن گزارے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، اور مجھے ایمانداری سے اپنی زندگی میں کسی پیچیدگی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں خوبصورت لڑکیاں تھیں، اور، یقینا، ایک نوجوان کے لئے ہمیشہ خواتین کی صحبت کی خواہش ہے. میلوا نے ہمیشہ اشارہ کیا کہ کچھ لڑکیاں میرے ساتھ باہر جانا چاہتی ہیں۔ لیکن بی ایم بی اسکول میں اچھی تعلیم، کچھ اصولوں کے ساتھ جن پر میں نے زندگی میں عمل کیا، جس نے مجھے بہت سی غلطیوں سے بچایا۔

لیڈی ہینکنز ایک مہربان منیجر تھے۔ 1977 کے آغاز میں، اس نے مجھے کیشیئر اور بوتھ میں کام کرنے کو کہا، جس میں بہت سے انتظامی فرائض شامل تھے۔ اس اسائمنٹ نے مینجمنٹ میں میری تعلیم کا آغاز کیا۔ میں صرف جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو زیادہ تنخواہ اور اتوار کے لیے ڈیڑھ گنا پیسے کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اس سال کے آخر تک اپنی پڑھائی پر توجہ دینے کا موقع دیا۔ 1977 بھی وہ سال تھا جب ہماری بہن گل بانو کی شادی ابراہیم فطانی سے ہوئی تھی۔ ابراہیم اور اس کے بڑے بھائی کریم، جو تیسری کلاس میں میرے کلاس فیلو تھے، اسکول کے بالکل سامنے رہتے تھے۔ ہم سب بھائیوں نے اس شادی میں اپنے والد کی مدد کے لیے ہر ایک نے 500 ڈالر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ خوش قسمتی سے منور کراچی میں تھے اور شادی میں شرکت کرنے کے قابل تھے۔ وہ ہمارے والدین کے لیے ایک بڑا مددگار ثابت ہوا۔ میں نے اس کتاب کو لکھتے ہوئے بہت غور کیا۔ میں نے اپنی بہن کی شادی کا تذکرہ کرنے اور تقریب سے کچھ تصاویر منسلک کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ میں اس کتاب کو ہماری خاندانی تاریخ کا اہم ذریعہ بنانا چاہتا ہوں۔ نکاح سے لے کر ولیمہ کے استقبال اور الوداعی تک تمام یادیں اور یادیں جمع کرنے کی کوش کی۔

جب میں نے کالج میں اپنا آخری سمسٹر شروع کیا تو میں نے پہلے ہی لیڈی ہینکنز کو آگاہ کر دیا تھا کہ میں وائٹ کالر جاب تلاش کروں گا۔ وہ اس کے ساتھ ٹھیک تھا۔ آخرکار، سال ختم ہو گیا، اور میں نے کامیابی کے ساتھ اپنے کورسز پاس کر لیے اور کمپیوٹر سائنس میں بی ایس کے لیے اپنی ضرورت پوری کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ، میں نے ہمیشہ قانونی طور پر زندگی گزاری، امیگریشن کے ساتھ اپنے ویزے کے انعقاد اور تجدید کی۔ اب جب کہ میرے اسکول کے دن ختم ہوچکے تھے،

میں نے 18 ماہ کے تربیتی ویزا کے لیے درخواست دی جو مجھے 1979 کے وسط تک لے جائے گا۔ سوچ رہا تھا کہ اس وقت تک، حقیقی دنیا کا کافی تجربہ حاصل کرنے کے بعد، میں شاید گھر واپس چلا جاؤں گا۔ میں نے گریجویشن میں شرکت کی۔

جنوری میں تقریب ہوئی اورجاب اسسٹنس پروگرام کا ڈیٹا پوائنٹ کارپوریشن،کے ساتھ مجھے عہدے کی پیشکش کی گئی۔

ان کے اکاؤنٹس پر کام کرنا قابل وصول نظام تھا اور یہ میرا پہلہ اچھا کام تھا۔ سیکھنے کو بہت سی نئی چیزیں تھیں۔ ڈیٹابس کی زبان، ایک کے لیے، جب مالیاتی نظام کی بات آتی ہے تو آسان نہیں تھی۔ اکاؤنٹس قابل وصول میرے لیے بالکل نیا موضوع تھا۔ میرا میجر کمپیوٹر سائنس تھا، ایک نابالغ کے ساتھ ریاضی اور انجینئرنگ۔

اس دوران میری ملاقات یوگنڈا سے ابراہیم کرمالی اور ان کے خاندان سے ہوئی۔ وہ اسماعیلی ہندوستانی تھے جنہیں، اگرچہ وہ ساری زندگی کمپالا میں رہے تھے، لیکن انہیں ایدی امین نے نکال باہر کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھے تھے، اور میں ان کے اپارٹمنٹ میں جانے لگا۔ ایک دن ابراہیم کرمالی کی بیوی زہرہ آنٹی نے مجھے حیران کن خبر سنائی کہ کمپالا سے میری عمر کے قریب ایک سنی لڑکی ہے۔

ہندوستانی پس منظر۔ کسی طرح، میں نہیں کہہ سکتا تھا. تو مجھے اس سےاور اس کے خاندان سے ملنے کو کہا گیا۔ ہم باقاعدگی سے ان کے گھر اس امید پر جانے لگے کہ میری منگنی ہو جائے گی۔ اس دوران، میری گریجویشن کے فوراً بعد، میرے دوستوں نے اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ کرمالی کے خاندان کو بھی ہمارے اپارٹمنٹ میں گریجویشن پارٹی میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ پارٹی کے بزرگوں میں سے ایک، یوگنڈا کے کمپالا کے اسکولوں میں سے ایک ریٹائرڈ پرنسپل، لڑکی کے چچا تھے۔ وہ ہمیں ایک اچھی تقریر کرنے کے لئے کافی مہربان تھے۔ ہارون، ہمارے ماہر باورچی اور ایک اچھے دوست نے اپنی پسندیدہ بریانی اور میری پسندیدہ آلو چاپ (ہیمبرگر کے گوشت کے ساتھ آلو کی چھوٹی پٹی) پکانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے والدین سے کئی بار اس صورتحال پر تبادلہ خیال کیا، لیکن میری ماں، خاص طور پر، امریکہ میں میری منگنی اور شادی پر کبھی راضی نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ اصرار کرتی تھی کہ جب میں واپس آؤں گا تو وہ پاکستان میں میرے لیے ایک بہتر میچ تلاش کرے گی۔

ڈیٹاپوائنٹ کارپوریشن پر واپس جائیں۔ میں نے چیلنج قبول کیا اور استعفیٰ دینے سے پہلے کچھ دیر ان کے ساتھ رہا۔ ایک بار پھر میری جان بچانے کے لیے لیڈی حینکن نے مجھے وقتی کام دیا۔ پیسہ اچھا تھا، اور، ایمانداری سے، میں نے اپنی کمپیوٹر سائنس پوزیشن سے محروم نہیں کیا. میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ جو وقت میں نے ریاضی، طبیعیات اور کیمسٹری سیکھنے میں صرف کیا وہ میری زندگی میں ضائع ہو جائے گا۔ پاکستان میں ہی مجھے ایک کمرشل انٹرپرائز شروع کرنا ۔چاہیے تھا اور گھر واپس رہ کر 200 یا 300 روپے ماہانہ پر کام کرنا چاہیے تھا اور اپنی زندگی سے خوش رہنا چاہیے تھا

اسی سال کے اوائل میں، جب میں اپنی یونیورسٹی کی پڑھائی اور گریجویشن مکمل کر رہا تھا، میرا بھائی اشرف ہیوسٹن میں آیا۔ اسے اپنا ویزا مل گیا تھا اور میرے دوسرے بھائی منور نے شکاگو آنے کی دعوت دی تھی۔ کسی طرح اس نے میرے ساتھ ہیوسٹن میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ہم پہلے ہی چار روم میٹ تھے: رزاق، ہارون، سونی اور میں۔ رات کے کھانے کے بعد اشرف نے مجھے خبر دی کہ کراچی میں میری پسند کی لڑکی کی اب شادی شدہ ہوچکی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ بسنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے 1973 کے دورے کے دوران پروپوز کرنے کی پوری کوشش کی تھی، لیکن میرے والدین نے مجھے شادی کی اجازت سختی سے مسترد کر دی تھی، جنہوں نے مجھے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ تاہم، یادیں واپس :آگئیں اور میرے دماغ کے پیچھے ایک گانا بج رہا تھا

؟ عجیب داستان ہے یہ کہاں شروع کہاں ختم

یہ منزلیں ہیں کون سی؟ نہ وہ سمجھ سکے نہ ہم

؟ عجیب داستان ہے یہ کہاں شروع کہاں ختم

یہ منزلیں ہیں کون سی؟ نہ وہ سمجھ سکے نہ ہم

؟ یہ روشنی کے ساتھ کیوں دھواں اٹھا چراغ سے

اس وقت تک، میں نے اپنے بھائی اشرف کی مدد سے بمشکل ڈاون پیمنٹ کرتے ہوئے ویسٹ فورٹی تھرڈ اور اینٹوائن پر ایک گھر خرید لیا تھا، جو اس وقت تک ہیوسٹن میں تھا۔ اور بھی دوست تھے جنہوں نے ٹیگ کیا اور گھر میں ہمارے ساتھ رہے۔

میرا اندازہ ہے، میں کمیونٹی کے پہلے نوجوانوں میں سے ایک تھا جس نے اپنا گھر حاصل کیا۔ میرے دو چھوٹے بھائی منور اور صمد بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے، اور ہمارے تمام دوستوں کو باہر جانے پر مجبور کر دیا۔

میں نے پہلے ہی بہت سی کمپنیوں کو اپنا نیا تخلیق شدہ ریزیومی بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ ڈیٹاایوائنٹ کارپوریشن کے علاوہ، میں نے سائنسی امیجنگ کمپنیوں میں سے ایک کے ساتھ بھی کام لیا، لیکن ایسا کچھ بھی سامنے نہیں آیا جو کیریئر بنانے کے لیے کافی امید افزا ہو۔ میں نے جو بہترین کام کیا ان میں سے ایک یہ تھا کہ میں نے اپنا ریزیومے کلے اور ونڈفرن پر واقع ہیوسٹن میں سیف وے کے ڈویژن آفس کے ڈیٹا پروسیسنگ ڈیپارٹمنٹ کو بھیجا۔

یہاں کوئی پچھتاوا نہیں۔ سیف وے کے ساتھ میری محنت کے نتیجے میں کچھ اچھی چیزیں برآمد ہوئیں، کیونکہ میں 1978 کے آخر میں اپنے گرین کارڈ کے لیے درخواست دینے کے قابل تھا۔

مارچ 1979 میں، میں نے گرین کارڈ کے لیے اپنی قبولیت کی کاپی حاصل کی اور، اسی دن، کراچی کے لیے اپنا ٹکٹ بک کیا۔ میرے بھائیوں نے خریداری میں میری مدد کی، اور میں امریکہ میں ساڑھے پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد پاکستان چلا گیا۔

اتنے عرصے بعد مجھے دیکھ کر میرے گھر والے خوش تھے۔ بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ میری بہن گل بانو کی شادی 1977 میں ہوئی تھی اور ان کی طلاق ہو گئی تھی اور اس کا ایک لڑکا فیصل تھا جو اس وقت دو ماہ کا تھا۔ میری بہن یاسمین کی منگنی امین کامدار سے ہوئی تھی جو میرے ہم جماعت تھے۔ اگرچہ میں نے اپنے والد کے ساتھ اس تعلق پر کئی بار دلائل دیے، لیکن مجھے اس حقیقت کو قبول کرنا پڑا کہ میرے والد اس اتحاد کے حوالے سے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کریں گے۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ اس نے کتنی لڑکیوں کو دیکھا اور میرا ہاتھ مانگا، لیکن گھر والوں میں سے کوئی بھی راضی نہیں ہوا ہے۔ شروع میں، میں بہت مایوس ہوا، لیکن ابراہیم کرمالی نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اپنا ارادہ نہ بنا سکا تو وہ میرے لیے ایک بہتر لڑکی تلاش کریں گے۔ اب یہاں مجھے کوئی امید نہیں تھی۔

اس چھٹی کے دوران میں اپنے والد صاحب کے ساتھ ان کے کام کی جگہ جاتا تھا اور کچھ دن زکریا موتن مجھے ان کے کام کی نئی جگہ پر لے جاتے تھے۔ زکریا موتن نے پہلے ہی اپنا ایکسپورٹ کنسلٹنگ بزنس قائم کر رکھا تھا۔ ایک دن، جب میں اور

والد صاحب آدم جی نگر سے اپنے والد کے کام کی جگہ کاٹھیاواڑ کی بس لے کر گئے، تو انہوں نے ایک ایسی بات کا ذکر کیا جو بہت پریشان کن تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب میرے چھوٹے بھائی نے گزشتہ سال پاکستان کے دورے کے دوران میرے بارے میں منفی باتیں کہیں تو وہ بہت حیران ہونے کے ساتھ ساتھ مایوس بھی ہوئے۔ اس نے میرے والد کو بتایا تھا کہ میں امریکہ میں اپنا وقت برباد کر رہا ہوں، اس کے اثرات میں الفاظ شامل کیے، "اسے دیکھو، اب اس کے پاس گرین کارڈ ہے، اور وہ منگنی کرنے پاکستان کا دورہ کر رہا ہے۔" لیکن میرے والد صاحب واضح طور پر جانتے تھے کہ میں نے خاندان کو کس قسم کی مدد فراہم کی تھی۔ مزید یہ کہ، میں نے اپنی اسکول کی تعلیم کم سے کم وقت میں، سوا چار سال میں مکمل کی تھی، پاکستان میں صرف 11 ویں جماعت مکمل کرنے کے بعد، اور 12 ویں جماعت کے لیے اپنا آخری امتحان دیے بغیر ہی یہ کامیابی حاصل کی تھی۔ والد صاحب کو واقعی مجھ پر فخر تھا۔ اس واقعہ سے میں نے جو سبق سیکھا وہ یہ تھا

یہاں ہمیشہ خاندان کے افراد اور رشتہ دار ہوں گے جو آپ کے مقام، آپ کی تعلیم، یا آپ کے معیار زندگی پر رشک کریں گے۔ کوئی توجہ نہ دینا۔ جو صحیح ہے کرو

ہمارے گھر میں ایک حاملہ خاتون، جس کا نام رخسانہ تھا، جو کہ میری بہن کی دوست تھی، گھر پر آئی تھی۔ وہ مجھے بہت پسند کرتی تھی، اور میں اس کے رویے سے متاثر بھی تھا۔ میں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ کیا رخسانہ کی کوئی بہن ہے تو اس نے کہا ہاں۔

ہمارا معمول رہا ہے کہ جب بھی ہم اپنے گھر والوں سے بات کرنا چاہتے، امی کے دوست مومن صدیق کو فون کرتے۔ میں میری امی کو مومن صدیق کے گھر جانے کو کہتا۔ جب ہم نے 30 منٹ میں دوبارہ فون کیا تو ماں وہاں پہنچ گئ تھیں ۔ میں شدت سے کچھ دوستوں سے بات کرنا چاہتا تھا تو میں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ کیا میں ان کا فون استعمال کر سکتا ہوں۔

میری زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آنے والی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ دو نوجوان خواتین کمرے کے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ پھر رخسانہ، جس کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا، سامنے آئیں۔ میں نے مومن بائی سے پوچھا کہ کیا میں ان کا فون استعمال کر سکتا ہوں؟ اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور فون دکھایا۔ فون کمرے کے ایک کونے میں تھا اور یہ تینوں نوجوان عورتیں مخالف سمت میں تھیں۔ جب میں اپنے دوست سے بات کر رہا تھا، میں ان کی باتیں

سننے کے قابل تھا۔ جب میں فارغ ہوا تو مومن بائی نے میرا تعارف خواتین سے کرایا۔ اچانک کلک ہوا کہ یہ دورہ اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ خواتین، ابراہیم شاو بوانی کی بیٹیاں، اپنی خالہ (پھپھی مومن) سے ملنے آئیں تھیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور معلوم ہوا کہ ان میں سے دو لڑکیوں کا نام یاسمین اور چھوٹی کا فردوس تھا۔ اللہ سب سے بہتر جانتا ہے. کسی نہ کسی طرح، میں یاسمین سے انگریزی میں بات کرنے لگا۔ اور اس نے بھی انگریزی میں ہی جواب دیا۔ چند منٹ بات چیت کے بعد مجھے کلک ہواکہ یہ ملاقت کا اہتمام میری بہن اور مومن صدیق نے کیا تھا۔ دونوں لڑکیوں نے ہندوستان میں پرورش پائی تھیں۔ سینٹ جوزف کالج کی گریجویٹ یاسمین روانی سے انگریزی بولتی تھیں۔

وہ دوسری دیسی لڑکیوں سے مختلف تھی۔ مجھے کچھ بہانے دیتے ہوئے، میری ماں نے اصرار کیا کہ میں مومن صدیق سے بات کر کے بتاؤں گی۔ اگر لڑکی دلچسپی رکھتی ہے اور مجھے پسند کرتی ہے، تو ہمیں ایک تجویز کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا. ایک دن کے اندر، میری ماں کو مثبت فیڈ بیک ملا اور اس نے اسے میرے لیے تجویز کیا۔

اب میری زندگی کے مشکل ترین دن آ گئے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے مستقبل پر کتنا گہرا اثر پڑے گا۔ مجھ سے کچھ دستاویزات فراہم کرنے کو کہا گیا، ساتھ میں میرے کاغذ (میرے گرین کارڈ کی منظوری) اور پرس، جس میں لائسنس اور بہت سے کریڈٹ کارڈز شامل تھے۔

یاسمین کی فیملی کے ساتھ۔ اس کے بہنوئی عارف، مومن صدیق کا بیٹا اور رخسانہ کا شوہر بھی دوحہ، قطر سے کراچی آئے، جہاں وہ کام کرتا تھا۔ ہم اس رات یاسمین کے اہل خانہ سے اپنی آخری ملاقات سے چند منٹ پہلے ملے تھے۔ میں ایک بار مومن صدیق کے گھر گیا تو دیکھا کہ بہت سے آدمی ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہیں۔ میرا ان سے تعارف ہوا۔ میں نے حاجی ابراہیم شاو (یاسمین کے والد) کے ساتھ ساتھ ان کے تمام بھائیوں، زکریا شاو، رزاق شاو، سلام شاو، بشیر ساؤ، یونس شاو، اور اقبال شاو سے ملاقات کی۔ زکریا شاو بہت باتونی تھے، اور اس نے مجھے بہت آرام دہ بنایا۔ بہت سے سوالات اٹھائے گئے تھے، بشمول میرے پاس گرین کارڈ کیوں نہیں تھا (مطلب ایک فزیکل کاپی کیونکہ میرے پاس صرف ایک منظوری کی دستاویز تھی)۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمام سوالات کا جواب بہت احسن طریقے سے دیا تھا۔ پھر ہم نے خاندانی گفتگو کا لطف اٹھایا۔ کافی کا گھونٹ پینا۔

اگلے دن میرا پرس واپس آ گیا تھا۔ یاسمین کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ میری امی قدرے نروس ہوئیں اور مومن صدیق سے ذاتی طور پر ملنے گئیں۔ وہ یہ خوشخبری واپس لے کر آئی کہ یاسمین کے والدین سنجیدگی سے ہماری منگنی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

ایک بار پھر، میری زندگی میں روشنی کا شعلہ چمکا۔ اسی دوران میری بہن یاسمین کی شادی کا دن سیٹ اپ تھا۔ میری چھٹیوں میں صرف چند دن باقی تھے، اس لیے میں اس کی شادی کے لیے ٹھہرنے سے قاصر تھا۔

آخر کار، میری ماں سے کہا گیا کہ وہ مجھے اور ایک دو دوستوں کوہمارے خاندان کے چند افراد ان کے گھر لے آئیں۔

یہ ہماری روایت میں ایک رسمی "ہاں" ہے، جہاں لڑکے کو لڑکی کے گھر بلایا جاتا ہے۔ میرا بھائی منور بھی اب تک کراچی میں تھا۔ وہ اپنی ہائی اسکول کی پیاری رحیمہ سے شادی کرنے کا بھی منصوبہ بنا رہا تھا، جو میرے کزن بھائی زکریا موتن کی بیٹی تھی۔ میری ماں اور میری تمام بہنیں، زبیدہ موتن (ایک کزن بہن)، میرے بھائی منور کے ساتھ، اور میں یاسمین کے گھر "ہاں" کہنے کے اس روایتی اور رسمی عمل میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ میں نے حاجی اقبال سے گاڑی ادھار لی تھی۔ جسے میں ہیوسٹن سے جانتا تھا اور اب کراچی میں آباد تھا۔

جمشید روڈ پر واقع یہ گھر کبھی افریقہ ہاؤس کے نام سے جانا جاتا تھا اور بعد میں اسے محمد شاو بوانی نے خریدا اور باوانی ہاؤس، جمشید روڈ کا نام تبدیل کر دیا۔ یہ پہلے ہی بہت سے لوگوں سے بھرا ہوا تھا جنہیں ہمارے استقبال میں مدعو کیا گیا تھا۔ جب ہمیں ان کے رسمی کمرے میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو میں نے دیکھا کہ سب ہمارے ساتھ شامل ہونے کے لیے پہنچ رہے ہیں۔ آخر کار یاسمین اپنے خوبصورت لباس میں نمودار ہوئی۔ اسے پہلی بار اپنے اتنے قریب دیکھ کر، ایمانداری سے، پہلی نظر میں محبت کی طرح تھا۔ ہم دونوں کو ایک گلاس دودھ میں چینی، پستے اور بادام ملا کر پینے کے لیے دیا گیا۔ ہم نے اپنے پھولوں کے ہاروں کا تبادلہ کیا۔ میں اپنے ساتھ انسٹنٹ پکچر کیمرہ لایا تھا اور میرے بھائی منور کے ساتھ کافی فلمی رول تھے۔ یہ ایک ہٹ تھا، کیونکہ آپ تصویر لینے کے چند منٹوں میں ہی تصویریں دیکھ سکتے تھے۔

میں نے معذرت کی اور یاسمین کی ماں سے اسے دو گھنٹے کے لیے باہر لے جانے کی اجازت طلب کی۔ تھوڑی سی مزاحمت کے بعد وہ راضی ہو گئیں اور ہم چلے گئے۔

۔میرے خاندان کے ساتھ ساتھ یاسمین کے خاندان نے ہمارے گھر پر ایک چھوٹی منگنی کی تقریب کا فیصلہ کیا

دن کا انتخاب کیا گیا، اور ہم دونوں نے فون پر بات چیت کر کہ ہم اس موقع کے لیے کس طرح کپڑے پہنیں گے۔ مجھے اور میرے خاندان کو اپنی چھت پر اس چھوٹے سے اجتماع کی تیاری کے لیے بہت محنت کرنی پڑی۔ ہم نے اپنے والد کے دوست یوسف لاکھانی سے جو کاٹھیاواڑ میمن ٹینٹ ہاؤس کا انتظام کر رہے تھے، سے کچھ ضروری سامان کرائے پر لیا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں یاسمین کے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں کو بھی بلانے کے لیے ان کی دکان پر جاتا تھا۔ وہ اتنی تیز بولتا تھا کہ کبھی کبھی انھیں سمجھنا مشکل تھا، لیکن وہ ایک مکمل شریف آدمی تھے اور ہمیشہ میرے والد اور ہم سب بھائیوں کا احترام کرتے تھے۔ اس نے بتایا کہ امریکہ میں ان کے کئی بیٹے بھی ہیں۔ البتہ بعد کی زندگی میں ان کا ایک بیٹا ۔ہاشم لاکھانی ہیوسٹن میں سکونت اختیار کر گیا اور ایک بہت ہی معروف بزنس مین بن گیا

اس نے ہمارا آرڈر لے لیا اور ان اشیاء کو بروقت بھیجنے میں کامیاب رہا۔ ہم نے خیمہ اور اسٹیج ترتیب دیا اور کچھ قالین نظر ۔آنے والی سترنگیوں کو لپیٹ دیا۔ یہ ایک اچھا اجتماع تھا اور پہلی بار ہم نے اپنی انگوٹھیوں کا تبادلہ کیا

شادی اور ہیوسٹن جانے کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ ہم تقریباً ہر رات ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ۔روزانہ فون پر بات کرتے تھے۔ ہم محبت میں تھے اور کبھی الگ نہیں ہونا چاہتے تھے

خاندان کے کچھ لوگ ایسے تھے جو ہماری منگنی سے خوش نہیں تھے۔ ان کے حسد اور کوتاہ نظری کو بھی سامنے لانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے یاسمین سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کے لیے یو ایس اسٹوڈنٹ ویزا حاصل کروں گا تاکہ ہم شادی کے بعد جلدی سے ہیوسٹن روانہ ہو سکیں۔ کیونکہ اس کے لیے میرا یاسمین سے علیحدگی کا تقاضا تھا، اس لیے میں بھاری دل کے ساتھ امریکہ واپس آیا۔ ہیوسٹن واپس پہنچنے پر، وہاں پہلے ہی ایک خط کا انتظار تھا۔ میں یونیورسٹی آف ہیوسٹن ڈاون ٹاؤن کالج سے کے لیے درخواست دینے اورغیر ملکی زبان کے طور پر انگریزی کا ٹیسٹ میں بیٹھنے کے لیے دستاویزات کی کاپیاں لایا تھا۔ کچھ دنوں کے اندر جاری کر دیا گیا، اور وہ امریکی سفارت خانے میں ٹیسٹ لینے کے قابل ہو گئیں۔ سب کو حیران کر دیا، بشمول اس کے خاندان، یہ ٹیسٹ بہت اچھے نمبروں کے ساتھ پاس کیا اور جلدی سے اسٹوڈنٹ ویزا کے لیے اپلائی کر دیا۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی کیونکہ مجھے اس کی ذہانت اور تعلیم پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کی تعلیم ہندوستان میں ہوئی اور اس نے ممبئی کے بہترین کالجوں میں سے ایک سینٹ جیویئرز میں تعلیم حاصل کی۔ وہ انگریزی، ہندی، فرانسیسی اور اردو

جانتی تھیں۔ میامی یونیورسٹی کے ڈین ڈاکٹر تھاور کے ساتھ امریکی سفارت خانے میں انٹرویو کے دوران، اس نے یاسمین کو بتایا کہ وہ یونیورسٹی میں اپنے طالب علموں کو اپنا مضمون دکھائیں گی۔ ڈاکٹر تھاور نے اس کی کامیابی پر مبارکباد دی اور اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ یہاں سیکھا سبق ہے۔

ہمیشہ اس پر توجہ مرکوز رکھیں جو آپ کو صحیح لگتا ہے اور کبھی بھی دوسروں پر توجہ نہ دیں جن کا آپ کی زندگی میں کوئی کاروبار نہیں ہے"۔"

میری بہن اور امین کی عمروں میں فرق کے باوجود میری بہن یاسمین کی شادی امین عبداللہ سے ہوئی۔

کچھ ہی دنوں میں میری پیاری یاسمین نے مجھے اپنی زندگی کی بہترین خبر کے ساتھ فون کیا۔ اسے چار سالہ سٹوڈنٹ ویزا ملا تھا۔

نومبر 1979، میں نے پاکستان ایک بار پھر روانہ ہوا۔

گھر والوں کے اتفاق کے بعد نومبر سترہ کو ہماری شادی طع ہوئی۔

حاجی اقبال میرے بہترین دوستوں میں سے ایک، اور رزاق باوانی (راجہ، ستار باوانی کے بیٹے - پریس والا)، میری شادی میں اچھے دوست رہے۔ خدا کا شکر ہے، فاروق ولی نے رضاکارانہ طور پر تصاویر کھینچیں۔

جیت پور میمن ایسوسی ایشن نے ڈنر پارٹیوں پر پابندی لگا دی تھی، اور سچ پوچھیں تو میں کوئی بڑا خرچہ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یاسمین، ہمارے فیصلوں میں میرا 100 فیصد ساتھ دیا۔

وہ دن آیا جب ہم میمن مسجد بولٹن مارکیٹ، جانے کے لیے تیار تھے۔

کی نماز۔ میرے والد اور میرے نکاح عصر کی نماز کے بعد طع تھا۔

میرے ماموں مجید کے پاس کاغزات سارے پہلے ہی سے موجود تھے۔

نکاح ہوا، اور ہم چلے گئے۔

۔مسجد نکاح کے لیے حاجی اقبال میرے خاندان کو لے کر مسجد روآنہ ہوئے جو ہم سے کافی دور تھی

عصر کی نماز مکمل ہونے کے بعد، مجھے آگے بڑھ کر بیٹھنے کو کہا۔ نکاح کا تمام کاغذی کام ساتھ ساتھ تیار تھا۔گواہوں کے ۔ساتھ میرے ماموں مجید اورچچا عثمان اورخواتین کی طرف زکریا شاو باوانی اور یاسمین کے والد ابراہیم شاو بوانی تھے

امام صاحب نے چند تلاوتیں کیں۔شادی سے متعلق قرآنی آیات اور اس موضوع پر حدیث (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ۔ارشاد) کی بھی وضاحت کی۔ اس کے بعد اس نے گواہوں کو بلایا جو اس شادی پر راضی تھے

اس کے بعد امام میری طرف متوجہ ہوئے اور تین بار پوچھا کہ کیا عقد نکاح قابل قبول ہے، جس کا میں نے جواب دیا (ہاں قبول ہے) تین پوچھنے کے بعد ہم دونوں کے لیے بہتر زندگی کے لیے دعا اور پھر تقریب ملتوی کر دی گئی۔ میرا سارا خاندان کے ساتھ ساتھ یاسمین کے اہل خانہ کے ساتھ ساتھ یاسمین کے اہل خانہ نے مبارک باد دی۔ جب ہم

باہر نکلے تو میرے تمام دوست وہاں موجود تھے۔ یقیناً ہر تصویر میں فاروق ولی غائب ہے۔ میں اس کا قرض کبھی نہیں چکا ۔سکوں گا۔ وہ کتنا شاندار آدمی تھا۔ اللہ ان کی بخشش عطا فرمائے۔ آمین

اس میں زندگی بھر کی اس وابستگی کے بارے میں ملے جلے جذبات تھے۔ میں خوش تھا کہ آخرکار میری شادی ایک ایسے شخص سے ہو رہی ہے جسے میں نہ صرف پسند کرتا تھا بلکہ جس کو میں دل و جان سے پسند کرتا تھا۔ ہم اس وقت تک جیون ساتھی ۔بننے والے تھے جب تک کہ ہم زندہ ہیں اور اچھے یا برے وقت میں ایک دوسرے کے لیے جینے کا وعدہ کیا

نکاح کے بعد ہم نے کاٹھیوار ہال میں اپنے دونوں خاندانوں کی ایک چھوٹی سی محفل میں شرکت کرنی تھی۔ ہم اپنی فیملی ۔کے ساتھ ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ زیادہ تر خواتین کا اجتماع تھا۔ مسجد مردوں کا اجتماع تھا

میں اور یاسمین دونوں صرف تین دن کے بعد ہیوسٹن جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہم اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لیے پرجوش تھے۔ یاسمین تھوڑی بے چین تھی اور اپنے خاندان کو پیچھے چھوڑنے پر افسردہ تھی۔ جیسے ہی ہم نیو یارک پہنچے اور اپنی امیگریشن اور کسٹم اسکریننگ مکمل کر لی، ہم ہیوسٹن کے لیے اپنی فلائٹ میں سوار ہونے کے لیے تیار تھے۔ جب ہم ایئر لائن کاؤنٹر پر گئے تو کسی نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ جیسے ہی میں مڑا، ایک افسر نے اپنا کسٹم بیج چمکایا اور مجھ سے کہا کہ میں اپنے سامان کے ساتھ ان کے ساتھ چلوں۔ اس نے اور ایک اور افسر نے مجھے ایک کمرے میں گھسایا اور جیبیں

خالی کرنے کو کہا۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے سوال کرنا شروع کر دیا، جبکہ دوسرا میرے سامان سے گزرا۔ آخر میں، انہوں نے طے کیا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے جس کا اعلان فارم میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ پہلے افسر نے مجھے صرف اتنا کہا کہ میں جا سکتا ہوں۔ میں نے جلدی سے بیگ اتارا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں یاسمین کو ڈیپارچر لاؤنج تک جاتی لفٹ میں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کیا ہوا جب ہم ہیوسٹن کے لیے ڈیلٹا ایئر لائنز کی پرواز کے لیے لائن میں کھڑے تھے۔

جب ہم ہیوسٹن پہنچے تو میرا بھائی اشرف، چند دوست اور ابراہیم کرمالی اور ان کی بیوی خالہ زہرہ اپنے بیٹے کے ساتھ ہمیں لینے کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہمیں ایک اچھی لنکن کار میں ہمارے گھر لے جایا گیا۔ خالہ زہرہ نے ہمارے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کچھ روایتی رسم تیار کر رکھی تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں بہت تھک چکے تھے۔

ہم سونے کے لیے گئے۔ اگلے دن میری چھٹی کا دن تھا، اور میرے پاس یاسمین کو سکھانے کے لیے بہت سی چیزیں تھیں۔ میں ہمیشہ اپنے بھائی اشرف اور اپنے دوستوں حاجی اقبال اور ہارون کا شکر گزار رہوں گا جنہوں نے ہمیشہ میری اور میری نئی شادی شدہ بیوی کی مدد کی۔

واپس آنے کے ایک ہفتے کے اندر، مجھے ہمارے ڈیٹا پروسیسنگ مینیجر، ڈیوڈ ویرمین کا پھر کال موصول ہوا۔ انھوں نے مجھے کارپوریٹ آفس میں ایک پروگرامر کے طور پرآر پی جی کے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی۔ اٹھارہ ہزار پانچسو ڈالر سالانہ تنخواہ پیش کی جس کو میں نے قبول کرلیا۔ اور مجھے کام شروع کرنے کی تاریخ دی گئی تھی۔

شعبہ ڈیٹا پروسیسنگ میں کام کرنا یہ معلومات میں میرے کیریئر کاآغاز تھا۔

میرا باس ڈیوڈ ورمن میری طرح قدرتی سائنس اور ریاضی میں بیچلر کی ڈگری مکمل کرنے کے ساتھ کام شروع کیاتھا۔ اس کی وجہ سے، اس نے میری بہت عزت کی اور مجھے ڈیٹا پروسیسنگ کے انس اور آؤٹ سکھانے لگے۔ ہمارے دفاتر کمپیوٹر روم کے بالکل باہر تھے۔ اس شعبہ میں ڈیٹا پروسیسنگ مینیجر، ڈیو وئیرمین، ہرب گرے، آپریشنز مینیجر، دو کمپیوٹر آپریٹرز، اور میں، ایک کمپیوٹر پروگرامر شامل تھے۔

- اگلے دنوں میں، میں نے بہت سے مین فریم ہارڈویئر کورسز میں شرکت کی، اور ساتھ ہی سان فرانسسکو، کیلیفورنیا کے قریب اوکلینڈ میں ہیڈکوارٹر کا دورہ کیا۔ میری تربیت کے چھ ماہ کے اندر، ہمیں پرانے سسٹ سے نئے میں تبدیل کرنے کا بہت بڑا پروجیکٹ دیا گیا۔ میری ذمہ داریوں میں تمام دستیاب مقامی نظام، اور پے رول کو مرتب کرنا شامل ہے۔ باقی سسٹم جیسے خریدار، اور انوائس مینجمنٹ سسٹم ہیڈ کوارٹر کی طرف سے تعاون یافتہ تھے۔ ہم انسٹال کرنے اور جانچنے کے لیے ٹیپ وصول کرتے تھے۔ ایک بار جب میں نے ڈیٹا پروسیسنگ ڈیپارٹمنٹ کا انتظام سنبھال لیا، میں نے اپنا اپ ڈیٹ شدہ ریزیومی بھیجنا شروع کر دیا۔ اسی دوران، یاسمین اپنے ڈاکٹر کے پاس گئی، جہاں اسے پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ حیرت انگیز خبر تھی، اور ہم نے فوراً اپنے گھر والوں کو مطلع کیا۔ منور پہلے ہی وہاں سے چلے گئے تھے، اور دوسرے بھائی ہمارے گھر کی قیمت میں سے اپنا حصہ لے کر اپنے طور پر رہنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے والد کو صورتحال کے بارے میں بتایا اور وہ مجھے اپنے مشورے میں بہت واضح تھے۔ ہم نے کریڈٹ پر شادیوں کے دوران رقم ادھار لی تھی۔ انھوں نے کہا کہ گھر بیچ دو، قرض ادا کرو، اورپیسے ۔میرے بھائیوں میں تقسیم کرو

میں نے اپنے والد کی ہدایت کے مطابق کیا۔ یاسمین اور میں لیز پر لینے والے اپارٹمنٹ میں چلے گئے۔ یہ منگم کے قریب واٹونگا پر بالکل نئے اپارٹمنٹس (لامونٹے پارک) تھے، جو اس سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں ہم رہتے تھے۔ یوسف، ڈیلاس سے ایک دوست، اس کی بیوی اور ان کا چھوٹا بچہ ہیوسٹن میں ہم سے ملنے آتا تھا، ہم چائناپیلس ریستورانٹ جاتے تھے۔ ان کی مچھلی ایک خاصیت تھی اور ہم ہمیشہ اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جب ہم گھر آئے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے ۔کہ یاسمین کوپیٹ میں درد ہونے لگا

وہ اپنے 8ویں مہینے میں تھی۔ جب ہم نے اس کے گائناکالوجسٹ کو فون کیا تو اس نے ہمیں اپنے پاس لانے کو کہا۔ ہمیں فوراً ہسپتال کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یوسف گاڑی چلا رہا تھا جبکہ اس کی بیوی نصرت اسے پرسکون کر رہی تھی۔ میں پچھلی سیٹ پر اس کے بالکل ساتھ بیٹھا تھا اور امید کر رہا تھا کہ ہم جلدی سے ہسپتال پہنچ جائیں گے۔ یہ نارتھ ویسٹ ہیوسٹن میں منگم سے ہسپتال تک ایک لمبی ڈرائیو تھی۔ جب ہم آخر کار پہنچے تو یاسمین کو فوری چیکنگ کے لیے ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ اسے آرام دہ بنانے اور چند ٹیسٹ کرنے کے بعد، ہسپتال کی ٹیم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ غلط الارم تھا۔

بچے نے اس کے پیٹ میں لات ماری ہوگی جس سے درد پیدا ہو رہا ہے۔ اس کی مقررہ تاریخ 25 تاریخ ہے، ڈاکٹر نے 26 تاریخ کو سی سیکشن شیڈول کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں سارا وقت اس کے ساتھ رہا اور اپنے نوزائیدہ کی بہت سی تصویریں کھینچنے کا انتظام کر لیا تھا۔ اگر لڑکی ہوتی تو شرمین کا نام ہم پہلے ہی چُن چکے تھے اور اگر اتفاق سے لڑکا ہوتا تو نعمان۔ تو میری سب سے خوبصورت بیٹی شرمین کی پیدائش 26 دسمبر 1980 کو ہوئی جب ہم اس اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ مجھے اپنے سال کے اختتام کی بنیاد پر تنخواہ میں تھوڑا سا اضافہ ملا۔ یقینی طور پر، ہمارے خاندان میں نئے اضافے کے پیش نظر یہ اضافی آمدنی انتہائی خوش آئند تھی۔ اس وقت کے ہمارے بہترین دوست، رفیق لویا اور عائشہ لویا نے اس پورے وقت میں بہت تعاون ۔کیا، ساتھ ہی ساتھ اس وقت کے ہمارے بیچلر دوست، حمید زکریا اور مسعود ہارون موتن نے بھی

میں اور یاسمین دونوں نے کیٹی میں ایک نئے گھر کی تلاش شروع کی۔ ہمیں بارکر سائپرس کے قریب سلور مل سب ڈویژن میں کچھ نئے ٹاؤن گھر بنائے جا رہے تھے۔ یہ نئے گھر ہمارے خاندان کے لیے پرکشش اور کافی بڑے تھے۔ اس بار، میں نے اپنے والد کے مشورے پر عمل کیا اور یاسمین اور میرے علاوہ کسی اور کو خریداری کے معاہدے پر دستخط کرنے کی اجازت نہیں دی۔ رہن کی شرح بہت زیادہ تھی، جو 14 اور 16 فیصد کے درمیان چل رہی تھی۔ نئے گھر کی قیمت تقریباً 54,000 ڈالر تھی، اور میری ادائیگی، ٹیکس اور انشورنس کے ساتھ، تقریباً 750 ڈالر ماہانہ بنتی ہے، جو سے میری ماہانہ آمدنی کا تقریباً 50٪ ہے۔ یاسمین نے فیصلہ کیا کہ وہ شرمین کے ساتھ اپنے اور میرے خاندان سے ملنے کے لیے پاکستان کا دورہ ۔کرے گی

میں نے شام کو ایک سیلز پرسن کے طور پر دوسری نوکری لینے کا فیصلہ کیا اور ایک فولیز اسٹور میں نوکری مل گئی۔ یہ ڈپارٹمنٹ اسٹور، جو ویسٹ اوکس مال میں بنایا جا رہا تھا، اپنے الیکٹرونکس ڈپارٹمنٹ کے عملے کو بھرتی کر رہا تھا۔ ابتدائی طور پر تمام چیزوں کی جینز فروخت کرنے کے لیے کام پر رکھا گیا، 60 دن بعد مجھے الیکٹرانکس ڈیپارٹمنٹ میں منتقل کر دیا گیا، جہاں میں کمپیوٹر سمیت تمام الیکٹرانک اشیاء فروخت کرنے کے قابل ہو گیا۔ فولیز مجھے کمیشن کے ساتھ ساتھ 20 گھنٹے کام کرنے کی تنخواہ بھی دے رہا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال وہاں کام کرنے کے بعد میں تھک چکا تھا۔ اسی دوران 10 جون 1983 کو ہمارا ایک اور بچہ پیدا ہوا، ہمارا بیٹا نعمان۔ بیٹے کی پیدائش سے میرے خاندان کے بیشتر افراد حیران رہ گئے، کیونکہ ان کی پیشین گوئی کچھ اور تھی۔ اگرچہ ہم دونوں نے ایک صحت مند لڑکے کے لیے اللہ سے بہت دعائیں کی تھیں لیکن

ایک اور بیٹی کے ساتھ ہم بے حد خوش ہوتے۔ بیٹیاں باپ کی آنکھ کا تارا ہوتی ہیں اور یقیناً شرمین نے صرف خاندان کا حصہ بن کر ہمیں ایک خوبصورت زندگی دی تھی۔ میں نے دوسری کمپنیوں کے ڈیٹا پروسیسنگ ڈیپارٹمنٹس میں کام تلاش کرنے کے لیے ریزیومے بھیجنا شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے آخر کار کریڈٹ بیورو آف گریٹر ہیوسٹن کے ساتھ ان کے آن لائن سسٹم کے لیے اسمبلر پروگرامر کے عہدے کے لیے ایک انٹرویو دیا۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا لیکن تنخواہ اچھی تھی، اور ہم دو بچوں کے ساتھ اچھا کام کر رہے تھے۔ ہم اپنے والدین کے اخراجات بھی اٹھانے کے قابل تھے۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ مجھے دوسری نوکری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آخر کار، ہم آرام سے اپنے مالی معاملات کو سنبھالنے میں ۔کامیاب ہو گئے

نعمان نے ہماری زندگیوں میں ایک اور جہت لائی۔ ہمارا تین افراد کا خاندان اب بہت مصروف ہو گیا تھا کہ ہم چار ہوگئے تھے۔ شروع شروع میں شرمین کو گھر میں کوئی اور بچہ پسند نہیں آیا لیکن اسے اپنے بھائی کی عادت پڑ گئی۔ اس وقت یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارا ایمان ہمیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی روزی کے راستے اور اسباب مہیا کرتا ہے اور آپ کے وسائل کو آپ کی ذمہ داریوں کے تناسب سے بڑھاتا ہے۔ کچھ مشکل وقت تھے، اور مجھے اپنی بیوی پر فخر ہے، جس نے کبھی شکایت نہیں کی اور نہ ہی مجھے اپنے والدین کو پیسے بھیجنے سے روکا۔ درحقیقت، اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں نظم و ضبط اختیار کروں اور باقاعدگی سے پیسے بھیجنا شروع کر دوں، اس لیے میرے والدین کو کبھی اس کی فکر نہیں کرنی پڑی۔ یہ نظم و ضبط ہماری روزی روٹی کو برقرار رکھنے میں انتہائی مددگار ثابت ہوا ہے۔ جب آپ اپنے ماں باپ پر خرچ ۔کرتے ہیں تو اللہ آپ کے مال میں اضافہ کرتا ہے اور بہتر صحت عطا کرتا ہے۔ اور صدقہ گھر سے شروع ہوتا ہے

یاسمین اور بچے فیملی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے پاکستان روانہ ہو گئے۔ وہ بہت بہادر خاتون ہیں اور دونوں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ میں صرف تصور کرسکتا ہوں کہ جب آپ بیرون ملک سفر کرتے ہیں تو ایک بچے کو بھی سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے، اور اس نے دونوں کو سنبھال لیا۔ بدقسمتی سے، میرے خاندان، خاص طور پر میری ماں اور بڑی بہن کی کم نظری نے مدد نہیں کی۔ ایک بار پھر، میرا ارادہ ہے کہ آنے والی نسل اس واقعے سے سبق حاصل کرے۔ میری ماں کی توقع یہ تھی کہ بہو، جو اپنے والدین کو دیکھنے کے لیے صرف چند ہفتوں کے لیے وہاں ہے، اس کے ساتھ رہے اور روزمرہ کے کاموں میں مدد کرے۔ چاہے یہ سوچ ہماری ثقافت اور روایت سے آئی ہو جو ہمارے ہندو پس منظر سے چلی گئی ہو یا

مقامی کمیونٹی کی توقعات سے، یہ بالکل غلط اور ناقابل قبول تھی۔ یاسمین کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا گیا، اور میرے بھائیوں نے بھی کوئی مدد نہیں کی۔ مسئلہ کو سمجھنے کے بجائے، ان میں سے کم از کم ایک نے اس مسئلے کو اچھالا جس سے اور بھی بدمزگی پیدا ہوئی۔ یہ سفر ہمیشہ سے بگڑتی ہوئی صورتحال کا صرف آغاز تھا۔ ہمیں اپنی بہوؤں کی عزت کرنا سیکھنا چاہیے اور ان کے ساتھ اپنی بیٹیوں جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ سب کے بعد، انہوں نے اپنے خاندان کو چھوڑ دیا ہے اور ایک مکمل اجنبی کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے کا انتخاب کیا ہے.

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میں کام کرتے ہوئے، ایک دن مجھے ہیوسٹن میں ایک بڑے ہیرے کے دوبارہ فروخت کنندہ کا فون آیا۔ یہ کال سٹور کے ساتھ ایک سکیورٹی تفتیش کار کی طرف سے تھی، جو مجھ سے ملنے کے لیے شدت سے چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے دفتر میں آیا، اس نے مجھے دکھایا کہ امریکن ایکسپریس پر کچھ ہیرے کی انگوٹھیاں دھوکہ دہی سے لگائی گئی ہیں۔ جب ان کا اس شخص سے رابطہ ہوا تو اس نے ان سے کہا کہ میں برے کردار کا آدمی ہوں اور وہ مجھ سے تفتیش کریں۔ خوش قسمتی سے، کمپنی نے شائستگی سے مجھے بتایا کہ ان کے پاس سی سی ٹی وی تصاویر ہیں اور وہ صرف اس بات کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ وہ میری نہیں ہیں۔ ایک پولیس افسر بھی میری غیر موجودگی میں ہمارے گھر آیا اور میری بیوی نے اسے بتایا کہ وہ وہاں نہیں رہتا۔ بدقسمتی سے جس شخص نے مجھے بدنام کیا وہ خاندان کا فرد تھا۔ ایک بار پھر، یہاں سیکھا سبق یہ ہے

ایسے خاندان کے افراد اور رشتہ دار ہمیشہ رہیں گے جو آپ کے مقام، تعلیم، یا آپ کے معیار زندگی پر جلتے رہیں گے۔ کوئی " توجہ نہ دینا۔ جو صحیح ہے کرو۔ اگر آپ اچھی حلال (قانونی) رقم کماتے ہیں تو آپ کو اس سے لطف اندوز ہونے کا حق ہے، لیکن صدقہ دینا نہ بھولیں۔

کریڈٹ بیورو میں میری نئی ملازمت میں صرف تین ماہ ہوئے تھے جب مجھے نیش وِل، ٹینیسی میں ہاسپٹل کارپوریشنز آف امریکہ کے جوائے رچرڈسن کا کال موصول ہوا۔ میں نے ان کے امریکی کنٹریکٹر کے ساتھ ریاض کے کنگ فیصل ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں پروجیکٹ لیڈر کے عہدے کے لیے درخواست بھری تھی۔ میں چونک گیا لیکن کال ریسیو کر کے بہت خوش ہوا۔ حیران، کیونکہ میں نے کبھی سعودی عرب میں ملازمت کے لیے کوئی کال موصول کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور خوش ہوا کیونکہ میں نے ہمیشہ اپنے خاندان اور والدین دونوں کے خاندان کو ہمیشہ خوش اور صحت مند رکھنے کے لیے

ایک بہتر موقع کی دعا کی تھی۔ میں نے اس پوزیشن کو حاصل کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے بچوں کے لیے ایک محفوظ جگہ مہیا کرنا چاہتا تھا، ایک ایسی جگہ جہاں وہ بغیر کسی خوف کے مذہب پر عمل کر سکیں، مسجد میں نماز ادا کر سکیں، اور ہماری مقدس کتاب قرآن سیکھ سکیں

# CHAPTER 7

## 1985 TO 1998 - LIFE IN SAUDI ARABIA

ایچ سی اے نے فون پر میرا انٹرویو کیا اور دو دن بعد مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ ویک اینڈ پر نیش وِل آ سکتا ہوں۔ میں نے اتفاق کیا، اور ایک جمعہ کو ہم اپنے جاب کے انٹرویو کے لیے نیش وِل روانہ ہوئے۔ یہ دورہ ایک دو روزہ کریش کورس تھا جس میں مملکت میں زندگی کے ساتھ ساتھ میری پوزیشن دونوں کی طرف واقفیت شامل تھی۔ سب سے پہلے جو الفاظ ہم نے سیکھے وہ تھے آئی بی ایم کے معنی، انشاء اللہ (اگر خدا نے چاہا)، بکرا (کل یا اگلے دن) اور مالش (کوئی بات نہیں)]۔

جیسے ہی مجھے معاہدے کی ایک کاپی دی گئی، میں اپنی تنخواہ میں سے تک بڑھتے ہوئے دیکھ کر بہت پرجوش تھا۔ انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ رہائش مفت ہوگی، بجلی، پانی، یا دیگر سہولیات کے لیے کوئی چارج نہیں ہوگا۔ بچوں کی تعلیم نجی امریکی اسکولوں میں ہوگی، اور اخراجات کمپنی برداشت کرے گی۔ تنخواہ اور مراعات کے علاوہ، وہ پورے خاندان کے لیے سال میں ایک بار ہیوسٹن، ہمارے اصل مقام کے لیے ہوائی کرایہ ادا کریں گے، ساتھ ہی ساتھ میرے لیے امریکہ میں ہر سال اپنی پسند کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے ٹکٹ بھی دیں گے۔ سالانہ پینتالیس دن کی ادا شدہ تعطیلات، بشمول پورے خاندان کے لیے راؤنڈ ٹرپ ٹکٹ، نیز حج کے دوران 10 دن کی چھٹی اور رمضان میں سات دن۔ یاسمین اور میں دونوں اس نئے ایڈونچر کے لیے کافی پرجوش تھے۔ پیر کو، میں نے اپنے باس کو مطلع کیا کہ میں یہ نوکری لینے جا رہا ہوں، دو ہفتوں میں کمپنی کے ساتھ اچھی شرائط پر رخصت ہو رہا ہوں۔ یہ مارچ 1985 کا اختتام تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ویزوں کے اجراء میں کتنا وقت لگے گا یا ہمیں سعودی عرب جانے کے لیے اور کیا ضرورت ہوگی۔ عمل کے دوران، دو ہفتوں کے اختتام پر، مجھے نیش وِل سے کال موصول ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ میرے فیملی ویزا کو مسترد کر دیا گیا ہے اور ہسپتال کو دوبارہ درخواست دینا ہوگی۔ مزید کئی ہفتوں کے بعد دوبارہ ویزے دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس بار ہسپتال نے مجھے یہ اختیار فراہم کیا کہ میں ملازمت اختیار کروں اور خاندان کو عارضی طور پر چھوڑ کر خود ہی چلا جاؤں۔ مجھے اس تجویز سے انکار کرنا

پڑا، لہذا ہسپتال نے مختلف تجاویز پیش کرنا شروع کیں، جن میں یہ بھی شامل ہے کہ مجھے ہیوسٹن میں ایک اور نوکری مل جائے۔ یقینی طور پر، میں تیار نہیں تھا

اس کے لیے میں نے اپنے رہنے کی ادائیگی اس امید پر چھوڑ دی تھی کہ ہم سعودیہ روانہ ہو جائیں گے۔ ہاؤسنگ مارکیٹ اس وقت اتنی خراب تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ میں گھر فروخت نہیں کر سکوں گا۔ یہ گھر، جسے میں نے خریدا تھا، 50٪ کے خالص نقصان کے لیے اس کی قیمت کے برابر ہو گئی تھی۔ ہم آخر کار بینک کی طرف سے مجبور ہوئے اور مجبورا ہمیں وہ گھر چھوڑنا پڑا۔ دو ہفتے بعد گھر خالی کرنے پر ہم کرآئے کے مکان کرک ووڈ پر ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ میں چلے گئے۔

خاندان کے ساتھ اپارٹمنٹ کمپلیکس میں رہنا ایک مختلف زندگی تھی۔ ایک اچھا تالاب تھا جہاں شرمین کو تیراکی کا مزہ آتا تھا اور دو سالہ نعمان نے تیرنا سیکھا تھا۔ اس دوران، میں نے ہسپتال کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھا، مختلف آپشنز کو دیکھتے ہوئے، کیونکہ میرا ہیوسٹن میں دوسری نوکری تلاش کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اداس ہونے کے بجائے ہم نے بچوں کو اورلینڈو میں ڈزنی لینڈ لے جانے کا فیصلہ کیا۔

میرے بھائی اشرف پہلے ہی اورلینڈو منتقل ہو چکے تھے۔ انھوں نے ہمارا استقبال کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ ہم نے تمام پیکنگ اور ہمارا سارا سامان رفیق لویا کی گھر پر چھوڑ دیا۔ کسی نہ کسی طرح، ہمیں یہ احساس تھا کہ اگلے دو تین ہفتوں میں ہمارے ویزے مل جائیں گے۔ اشرف نے اورلینڈو میں ہمارا استقبال کیا۔ وہ بہت مہربان تھا اور ہمیں اپنے اپارٹمنٹ میں رکھا۔ ہم ڈزنی ورلڈ ہر روز جاتے جب تک ہم اس سے تھک نہیں جاتے۔ نعمان اور ندا (اشرف کی بیٹی) بہت چھوٹی تھیں، اور نعمان گاڑی میں بیمار ہو جاتا تھا، کیونکہ اورلینڈو میں ہمیشہ گرمی رہتی تھی۔

آخر کار، یہ ہوا۔ ایچ سی اے کو خیال آیا کہ وہ میرے پورے خاندان کے لیے کراچی جانے کے لیے ٹکٹ ادا کریں گے، اس لیے میں انھیں پاکستان میں رکھ سکتا ہوں۔ میرا ٹکٹ ریاض تک جاری کیا گیا تھا، جہاں میں اپنا کام شروع کروں گا۔ انہوں نے یہ بھی تجویز کیا کہ جب میں وہاں ہوں تو فیملی ویزا کے لیے درخواست دینا بہت آسان ہو گا۔

ہم نے پیکنگ شروع کی۔ ہمارے پاس تقریباً 10 بکسے تھے۔ ہمارے ٹکٹ اور پاسپورٹ ڈاک کے بھیجے گئے تھے۔ میرے بھائی منور اور ایک بھتیجے یعقوب موتن کا شکریہ جنہوں نے ہمیں ایئرپورٹ تک لے جانے میں مدد کی۔ مجھے یقین دہانی کرائی

گئی کہ مجھے میرے ٹکٹ اور دستاویزات پہنچانے کے لیے ہوائی اڈے پر کوئی ڈاکیہ تلاش کرے گا۔ چنانچہ ہم وہاں سے نکلے اور ائیرپورٹ پہنچے۔ منور کسی طرح ٹکٹ کاؤنٹر پر موجود شخص کے ساتھ میرا تمام سامان چیک کرنے کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گیا، حالانکہ ٹکٹ فی ٹکٹ کے صرف دو کے کی اجازت تھی۔ اب ہمیں ڈاکیہ کے آنے کا انتظار کرنا تھا۔ ان دنوں سیل فون نہیں تھے، لیکن میں عوامی ٹیلی فون استعمال ہوئے سے مسلسل رابطے میں تھا۔

آخر کار، لڑکا پیکج لے کر آیا اور ہم ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ کراچی پہنچتے ہی تمام کسٹم افسران کو میرے نام کی بیلٹ پر سامان کے اتنے بکسوں کو دیکھ کر مجھ پر شک ہونے لگا۔ انہوں نے کئی بکس کھولے۔ ہماری کچھ کراکری کوڑے دان میں ڈال دی گئی۔ کسٹم افسر کو ہم سے ہمدردی ہوئی اور یہ سن کر جانے دیا کہ میں 13 سال کی غیر حاضری کے بعد گھر واپس آ رہا ہوں۔ ہم آدم جی نگر میں اپنے والد کے گھر آئے۔ میں اپنے خاندان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا، جنہوں نے ہمارے لیے ان کے ساتھ رہنے کا انتظام کیا تھا۔ میرے لیے اپنے والد کو یہ سمجھانا بہت مشکل تھا کہ ڈبوں اور سامان کو اپنی ساس کے پاس منتقل کرنا بہتر ہوگا کیونکہ ہمارا گھر بہت چھوٹا تھا۔ بہت بحثوں کے بعد، ہم تمام ڈبوں اور سامان کو اپنی ساس کے پاس لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں تھوڑے دنوں کے بعد ریاض چلا گیا، جبکہ میرا خاندان میرے سسرال کے پاس چلا گیا۔ ایک اور سبق: اپنے بچوں اور ان کی شریک حیات کو آپ کی اپنی روایات اور فرسودہ ثقافت کے مطابق ہونے پر اصرار کرنے کے بجائے اپنے فیصلے خود کرنے کے لیے جگہ فراہم کرنا یاد رکھیں۔

آخر کار میں خوبصورت اور نئے تعمیر شدہ ریاض کنگ خالد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترا۔ ہسپتال سے ایک سعودی شریف آدمی احمد مجھے لینے کے لیے باہر انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے کنگ فیصل سپیشلسٹ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر لے گئے، جو ایک بہت بڑا کمپاؤنڈ تھا، جو اس وقت ریاض کے سب سے بڑے کمپاؤنڈز میں سے ایک تھا۔ مجھے ہسپتال کے بالکل سامنے، میڈیکل سٹی ویلج میں تین بیڈ روم کا ایک چھوٹا سا ٹاؤن ہاؤس تفویض کیا گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ فرج میں کافی گروسری ہے اور اگر مجھے مزید کچھ چاہیے تو گروسری اسٹور (بعد میں العزیزیہ سپر مارکیٹ کا نام دیا گیا) پیدل فاصلے کے اندر تھا۔

مجھے آپ کو بتانا ضروری ہے کہ میں ہسپتال، کمپاؤنڈ اور حیرت انگیز شہر سے کتنا متاثر ہوا تھا۔ ہر جگہ نئی شاہراہیں اور عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ یاسمین کو فون کرنے کے بعد، میں نے اور کچھ گروسری شاپنگ کی اور اب کھانا پکانے کے لیے تیار تھا۔ میں نے ابھی کچھ کیما بنا ہوا گوشت خریدا تھا، کیونکہ میرے لیے پکانا آسان تھا۔ میرے پاس کچھ چاول اور بہت

سے مصالحے تھے جو یاسمین نے مجھے دیے تھے۔ اب میں نے ایک بار پھر سے کھانا پکانے کے معمولات میں شامل ہونا شروع کیا جب میں بیچلر تھا۔ یہاں تک کہ کیما بنایا ہوا گوشت پکاتے ہوئے، مجھے شک ہوا کہ شاید یہ خراب ہو گیا ہے، لیکن مجھے پرواہ نہیں تھی، کیونکہ مجھے بہت بھوک لگی تھی۔ آخر میں، میں نے چاولوں کے ساتھ اپنا کیما بنایا ہوا گوشت کھانے کے لیے تیار کر لیا۔ گوشت کا ذائقہ مضحکہ خیز اور بہت نمکین تھا۔ لیکن، بھوکا ہونے کی وجہ سے اس وقت زیادہ فرق نہیں پڑا۔ برتن دھونے کے بعد، میں نے ردی کی ٹوکری کو باہر نکالا اور، کسی وجہ سے، کیما بنایا ہوا پلاسٹک کا پیکٹ اٹھایا، اور لیبل کو مزید قریب سے پڑھا۔ اب یہ سمجھ میں آیا۔ یہ بالکل ٹھیک، لیکن اونٹ کا گوشت تھا۔ عادت سے ہٹ کر لیبل پر خاص توجہ نہ دیتے ہوئے، میں نے فرض کر لیا تھا کہ کیما بنایا ہوا گوشت ہے۔ کیا مزہ ہے، میں نے اتنا لال مرچ ڈالا ہوگا کہ اس سے اونٹ کے گوشت کی بو ختم ہوگئی۔ ایک طرح سے، میں نے بہتر محسوس کیا کہ کم از کم گوشت ۔داغدار نہیں ہوا تھا جیسا کہ مجھے شبہ تھا

میں تھکا ہوا تھا اور اگلی صبح جلدی کام پر جانے کا ارادہ رکھتا تھا، اس لیے میں سو گیا۔ میرے ذہن میں بہت ساری نامعلوم چیزیں تھیں جنہیں میں نے کچھ دیر کے لیے اُچھال دیا اور آخر کار نیند آ گئی۔ میں جلدی اٹھا، نماز پڑھی، ناشتہ کیا، اور کام پر جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ جیسا کہ میں نے کہا، ہسپتال کے بالکل سامنے تھا اور میں سرنگ کو ہسپتال لے گیا۔ یہ سرنگ ہاؤسنگ ہسپتال کے مرکزی کمپاؤنڈ کو جوڑنے کے لیے زیر زمین بنائی گئی تھی۔ مجھے محکمہ میں دکھانا تھا، جو مرکزی عمارت کی پہلی منزل پر، سی ای او کے دفتر کے ساتھ تھا۔ میں جس سے بھی ملا وہ امریکہ سے تھا۔ وہ مجھے ہیوسٹن سے ہسپتال میں شامل ہوتے دیکھ کر بہت احترام اور پرجوش تھے۔ ہسپتال کے آدھے دن کے دورے کے بعد مجھے یقین تھا کہ میں خود ہی اس جگہ کے ارد گرد جانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ مجھے کمپیوٹر اینڈ ہسپتال انفارمیشن سینٹر لے جایا گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی جو ہسپتال کے عقب میں واقع تھی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ عمارت ہسپتال کی تعمیر کے دوران سائٹ کا دفتر رہی تھی۔ چونکہ یہ ہسپتال صرف رائلٹی فیملی کے لیے تھا، اس لیے انھوں نے اس ہسپتال کے لیے دل کھول کر بجٹ دیا ہوگا اور زیادہ تر امریکی ڈاکٹروں کو بطور مشیر مشق کرنے کے لیے لایا ہوگا۔ جیسے ہی میں ڈیٹا پروسیسنگ مینیجر (صلوٰۃ الجاسر) کے دفتر میں داخل ہوا، مجھے ایک عام حجاب والی خاتون کی توقع تھی۔ لیکن، اس کے بجائے، وہ ایک امریکی لباس پہنے ایک خوبصورت خاتون تھی جو روانی سے انگریزی بولتی تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور یہ دیکھنے بیٹھ گیا کہ

مجھے کس قسم کی اسائنمنٹس ملیں گی۔ میری پوزیشن میڈیکل ایپلی کیشنز پروجیکٹ لیڈر تھی۔ چونکہ مجھے ہسپتال کی درخواستوں کا کوئی علم نہیں تھا، اس لیے سیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے دیکھ کر بہت پرجوش تھی کیونکہ وہ ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو اس وقت اسمبلر اور آر پی جی کو جانتا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ ہسپتال کی درخواستیں بہت آسان ہیں اور زیادہ تر داخلہ/رجسٹریشن درخواست، جسے ہسپتال کیئر سسٹم کہا جاتا ہے، سے خریدا گیا تھا۔ وہ بہت مہربان تھی اور مجھے صارف اور تکنیکی رہنما فراہم کرتی تھیں۔ اس نے مجھے ایچ آر ڈیپارٹمنٹ کے ماہرین میں سے ایک کے بارے میں بھی رہنمائی کی جو پھر

اسی دن میرے خاندان کے ویزا کے لیے درخواست دینے میں میری مدد کی۔ کاغذات واپس کر دیے گئے اور دو ہفتے کے اندر خاندان کے لیے ویزے جاری کر دیے گئے۔ کمپنی نے ان کے ٹکٹوں کی ادائیگی بھی کی۔ میں نے یاسمین کو خبر دینے کے لیے فون کیا۔ عید الاضحی کو ایک ہفتہ سے بھی کم وقت باقی ہے، میرا خاندان میرے ساتھ منانے کے لیے تیار تھا۔ وہ عید سے ایک دن پہلے پہنچے تھے۔

وہ کمپاؤنڈ سے بہت متاثر ہوئے، کیونکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم نے کبھی امریکہ نہیں چھوڑا تھا۔ یہاں ٹینس کورٹ، سوئمنگ پول، جاگنگ ٹریک، ورزش کے کمرے، ایک چھوٹی گروسری اسٹور کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بہت سی سرگرمیاں تھیں۔ میرے خیال میں یہاں مجھے یہ بتانا ضروری ہے کہ کس طرح توسیع شدہ خاندان کے کچھ افراد میرے سعودی عرب جانے کے خلاف تھے۔ درحقیقت، ایک اجتماع میں کمیونٹی کے ایک بزرگ نے مجھے بتایا کہ سعودی ویزے پر لوگوں کو مدعو کرتے ہیں لیکن انہیں کبھی جانے کی اجازت نہیں دیتے، اکثر انہیں مزدوری کی خدمات پر مجبور کرتے ہیں۔ یقیناً یہ سب جھوٹ ثابت ہوا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس شریف آدمی کو کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ سعودی عرب میں پڑھے لکھے لوگوں کی عزت کی جاتی ہے اور وہ یقیناً اپنے ساتھیوں کی طرف سے احترام اور بھائی چارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

یاسمین اور میں بہت مصروف ہو گئے اور بچوں کو سرگرمیوں میں مقرر کر دیا۔ اس وقت شرمین کی عمرساڑھے تین برس تھی اور نعمان کی دو سال عمر تھی، اور ہمیں امریکن اسکول نے بتایا کہ وہ 5 سال سے کم عمر کے بچوں کو قبول نہیں کریں گے۔ یاسمین اور میں

شرمین کو برطانوی اسکول اور نعمان کو کمپاؤنڈ کے اندر نرسری اسکول کے پروگرام میں داخل کرانے کا فیصلہ کیا۔ جس دن ہم برطانوی سکول سے شرمین کا پیپر ورک مکمل کر کے واپس آئے

۔داخلہ، میں نے اس کا احساس کیے بغیر سرخ بتی سگنل سے گزر گیا

ریاض میں ریت کے طوفان اتنے زور دار ہیں، اور کئی بار

روشنی زیادہ نظر نہیں آتی. ایک پولیس والے نے مجھے روکا۔ جب وہ

؟میرے ساتھ خاندان کو دیکھا، اس نے پوچھا "کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ نے کیا کیا

میں نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے سرخ بتی کراس کی تھی، اور، مجھے ٹریفک سگنلز پر زیادہ توجہ دینے کی تنبیہ کرنے کے بعد، مجھے جانے دیا۔ میں ایک دوست کی کار چلا رہا تھا اور میرے ساتھ میرا امریکی لائسنس تھا۔ ہمارے ساتھ کوئی کاغذی کام نہیں تھا، کیونکہ ہم مملکت میں نئے تھے۔ جب میں نے یہ کہانی اپنے سعودی دوست کو سنائی جس نے مجھے اس کام کے لیے اپنی گاڑی دی تھی تو وہ چونک گیا۔ اس نے کہا کہ میں بہت خوش قسمت ہوں؛ ورنہ میں سرخ بتی کراس کرنے پر اور کاغذات نہ ہونے کی وجہ سے جیل میں ہوتا۔ یہ بادشاہت میں سیکھا ۔جانے والا سبق تھا

اگلا سال میرے لیے بہت مصروف تھا۔ مجھے ان پیشنٹ فارمیسی ڈیپارٹمنٹ فارمیسی کے لیے بوسٹن میں فارمیسی کانفرنس میں کچھ پیکجز چیک کرنے کا پروجیکٹ دیا گیا تھا۔ مجھے سٹیو شیرلنگ کے ساتھ اس فارمیسی کانفرنس میں شرکت کے لیے ۔بوسٹن روانہ ہونا پڑا، جو کہ کے سینئر فارماسسٹ اور مینیجر تھے

۔فارمیسی انوینٹری ڈیپارٹمنٹ. بعد میں سلیمان السلامہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔سلامہ، فارمیسی کے ڈائریکٹر

ریاض میں، میں الاباما یونیورسٹی کے تیار کردہ مین فریم لیبارٹری پیکج کو انسٹال کرنے میں مصروف تھا جس کا مظاہرہ ہمارے ۔لیب کے صارفین کو کر رہا تھا

یہ وہ سال تھا جب ہم نے سعودی عرب میں رہنے کا فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ میری پہلی ترجیح اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینا اور انہیں اسلامی معاشرے میں زیادہ بالغ ہونے میں مدد کرنا تھی۔ جتنی بار مجھ سے ہو سکتا تھا، ہم اپنے بچوں کو مسجد لے جاتے تھے، اور وہ گھر میں قرآن کے استاد سے سبق بھی لے رہے تھے۔ میں اس بات کو سامنے لانے کی وجہ یہ ہے کہ بعد میں میں آپ کے بچوں کو ایک ایسا ماحول فراہم کرنے میں شامل غلط فہمیوں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا جہاں وہ آسانی سے دین پر عمل کر سکیں اور سیکھ سکیں، حالانکہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ علم اور تعلیمات سے استفادہ کریں گے۔ یہ واقعی بچوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنی زندگی کیسے گزارنا چاہیں گے۔ ایک بار جب وہ بالغ ہو جاتے ہیں، بچے ہمیشہ اپنے والدین کے ساتھ ایک آنکھ سے نہیں دیکھتے، جنہیں اللہ نے انہیں صحیح راستہ دکھانے کے لیے چنا ہے۔ بطور والدین، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان کی رہنمائی کریں اور انہیں ممکنہ حد تک نصیحت کریں اور وہ تحفظ فراہم کریں جس کے وہ مستحق ہیں۔ لیکن ان دوستوں کو کنٹرول کرنا بہت مشکل ہے جن کے ساتھ وہ رفاقت کا انتخاب کرتے ہیں، جو ان کے بالغ ہونے کی قسم کا تعین کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ہیوسٹن میں جن خاندانوں کے بچے ہم نے چھوڑے ان میں سے کچھ عالم اسلام بن گئے، جبکہ بہت سے گمراہ ہو گئے۔ مجھے سعودی عرب میں کئی سال گزارنے پر کبھی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ اس نے ہمارے اپنے مذہب کے بارے میں میری سمجھ کو بہتر بنایا ہے۔ میں نے عربی کی کلاسیں لینا شروع کر دیں۔ سعودی وزارت نے مجھے صحیح البخاری اور صحیح المسلم دونوں کی کاپیاں فراہم کی تھیں، اسلام میں مستند احادیث۔ ہمارے بچوں کے سونے سے پہلے یہ کتابیں پڑھنا ہمارا معمول بن گیا تھا۔ مجھے اس وقت کے بہت سے علماء کی تخلیقات کے انگریزی ترجمے بھی ملے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم سال میں کم از کم ایک بار اور کبھی کبھی دو بار عمرہ کے لیے جاتے تھے۔ کئی بار ہم نے رمضان کے کچھ دن حرم میں گزارے اور قیام کے دوران دو حج بھی مکمل کیے۔ اللہ ہماری تمام نیکیاں قبول فرمائے۔ آمین اور امید ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ہماری زندگی کے تجربات سے سبق سیکھیں گی۔ سعودی عرب میں رہنے کا میرا ارادہ دوگنا تھا۔ پہلا، ہمارے معیار زندگی کو بہتر بنانا اور دوسرا، یہ یقینی بنانا کہ مذہبی جڑیں اور بنیاد ہمارے بچوں کے لیے کافی مضبوط ہوں۔ میری امید تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ میرے بچے سمجھدار ہوجائیں گے اور اپنی روح کی تلاش شروع کر دیں گے، جیسا کہ میں نے سیکھا اور

میں نے کیا۔ ہم سب آخر کار انسان ہیں اور اپنی زندگی میں غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ جو لوگ اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہیں ۔وہ اس زمین پر بہتر طور پر زندہ رہتے ہیں اور دوسروں کی مدد کرنے کا رجحان رکھتے ہیں

میری پہلی ترجیحات کراچی دوبارہ جانا اپنے اپارٹمنٹ کی چابیاں حاصل کرنا، اور میرے والدین کے لئے ریاض کے ویزے کی ۔درخواست دینا تھی

۔کراچی میں 1990 میں میرے والدین کو ویزا موصول ہوا

۔ان کے لیے راؤنڈ ٹرپس کے ٹکٹ بھیجے وہ آخر ریاض پہنچ گئے

جنوری، 1990 ریاض میں، کافی سردی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کا لطف اٹھایا۔ ان کے عمرہ کے ٹکٹ کا انتظام کیا اوربدھ کی نیت سے

ہم دوپہر کو روانہ ہوئے۔ اوراس شام ہم مکہ مکرمہ میں تھے۔

ہوٹل میں چیکنگ کرائی اور ہم سب سے پہلے رات کے کھانے کے لیے گئے اور واپس حرم آگئے۔

۔ہمارا عمرہ بہترین لمحات میں سے ایک طواف تھا جس میں میرے والد میرے دائیں طرف تھے اور میری ماں بائیں طرف

ہم نے مقام ابراہیم کے سامنے نوافل کی رسومات پوری کیں اور زم زم کا پانی پیا۔ میری ماں سائی کے لیے تیار نہیں تھی، اس لیے ہمیں اس کے لیے وہیل چیئر کی شکل میں کچھ ٹرانسپورٹیشن لینا پڑی۔ سائی کے فوراً بعد، ہم نے زم زم کا پانی پینا ختم کیا اور اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں اور ان کے بچوں سمیت پورے خاندان کے لیے ڈھیروں دعائیں کیں۔ پھر ہم ۔ہوٹل واپس آکر سو گئے۔ ابتدائی میں صبح ہم فجر کی نماز کے لیے گئے اورآکر ہمارا ناشتہ کیا

نماز ظہر کے بعد ہمیں مدینہ لے جانے کے لیے ایک ٹیکسی کیب

آئی اور ہم مدینہ روآنہ ہوگی ۔ مغرب کی نماز کے وقت کے قریب ہم مدینہ پہنچ گئے ۔ ہوٹل میں چیک کرنے کے بعد، ہم نے ۔اپنا کام شروع کیا

مسجد میں مغرب/عشاء ادا کرنے کے رات کا کھانا کھایا اور گھر آکر سو گئے۔ فجر نماز کے بعد میں اور والد صاحب زیارت کے لیے جب کہ میری امی نے ہمارا انتظار کیا اور پھر خود زیارت کیلئے نکل گئیں۔

میں اور میرے والد صاحب مسجد کے مختلف حصوں سے گزرے جن میں وہ جگہیں بھی شامل تھیں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اور مسجد کا وہ چھوٹا حصہ جسے جنت کا حصہ کہا جاتا ہے۔ جیسے ہی میری امی واپس آئیں، ہم مسجد کے عقب میں واقع سب سے بڑے قبرستانوں میں سے ایک جنت البقیع کے لیے روانہ ہوئے جہاں بہت سے شہداء جنگ، تیسرے خلیفہ عثمان بن عفان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم اور ان کے بہت سے لوگ تھے جن میں ان کی بیویوں کو بھی دفن کیا جاتا تھا. ظہر کی نماز اور ظہر کے کھانے کے بعد ہم ریاض واپس جانے کے لیے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ میرے لیے انتہائی اطمینان بخش اور میرے والدین کے لیے بہت پرامن سفر تھا۔

جیسے ہی میرے والدین پاکستان روانہ ہوئے، ہم نے دوحہ، قطر کے اپنے پہلے سفر کی تیاری کی، جہاں میری ایک سالی صاحبہ کئی سالوں سے مقیم تھیں۔ یہ مارچ 1990 کا سال تھا۔

ہم اس موسم گرما میں اپنے کراچی کے سفر کے بارے میں بہت پرجوش تھے، کیونکہ ہم پہلی بار کراچی میں اپنے ہی گھر میں رہ رہے تھے۔ جولائی 1990 کے اوائل میں، یاسمین اور بچے کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ میں کچھ دنوں بعد ان کے ساتھ شامل ہونے والا تھا۔ میں اپنی بیوی کا اس کی لگن کے لئے بہت شکر گزار ہوں۔ اس نے گھر کا ہر سامان اپنے بھائی کے ساتھ خرید لیا تھا اور وہ خوبصورت گھر اب ہمارا گھر تھا۔ آپ دونوں برامدوں سے پورا کراچی شہر دیکھ سکتے تھے۔ درمیانی کمرے کی بڑی کھڑکی سے آپ قائداعظم کا مقبرہ دیکھ سکتے تھے۔ برامدوں کے ساتھ دو بیڈروم ایئرکنڈیشنڈ تھے۔ ہم نے بائیں طرف کمرہ لیا، جبکہ بچے دائیں طرف اپنے سونے کے کمرے سے لطف اندوز ہوئے۔ گھر میں کافی جگہ تھی۔

ریاض میں حسینہ کی شادی کے لیے اپنے والدین کے ساتھ تمام شاپنگ کے بعد، اب ہم اس کی شادی کے لیے تیار تھے۔ والدین کو اس شادی کو صحیح طریقے سے منانے کی ضرورت تھی۔ میرا چھوٹے بھائی ابراہیم اور میں چاروں طرف گاڑی چلاتے تھے۔

میری رینٹل کار میں شہر اور شادی کے کھانے اور دیگر فنکشنز کے آرڈرز دیے۔ حسینہ بہت خوش تھی اور میرے والدین بھی، کیونکہ وہ شادی کرنے والی آخری بہن تھی۔

تیاریاں خوب چل رہی تھیں، اور میں نے اور میری بیوی نے اپنی جگہ پر دلہن کو تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اچھے ٹھنڈے بیڈ رومز میں تیار ہونے میں بہت مزہ آیا۔ ایک بار جب وہ تیار ہو گئی، ہم اسے اپنی کار میں اپنے والدین کے گھر لے گئے، جہاں ہم اس کی شادی کے لیے دوسرے تمام عبوری کام کرنے جا رہے تھے۔

کراچی میں چھٹی کے بعد میرے لیے شاید ہی کوئی چھٹی باقی تھی۔ جب ہم کراچی میں جہاز میں سوار ہوئے تو کپتان ہمارے پاس آیا اور اعلان کیا کہ کویت کو عراق کا صدام حسین نے فتح کر لیا ہے۔ اس وقت ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ چند سالوں میں یہ کتنا برا ہونے والا ہے۔ جب ہم ریاض میں اپنے گھر واپس آئے تو مجھے ایک اہم ملاقات کے لیے امریکہ روانہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ، 1990 تقریباً مکمل طور پر سفر کے لیے وقف کر دیا گیا تھا، اور ہم نے اپنے ہر ایک سفر کا لطف اٹھایا۔

مارچ 1991 کے اوائل میں، ہم نے یاسمین کی بڑی بہن رخسانہ آپا اور ان کے شوہر عارف بھائی سے دوحہ قطر جانے کا فیصلہ کیا۔ دوحہ میں کچھ اچھے محلے اور خوبصورت ساحل ہیں۔ یہ ریاض کی طرح گرم ہے، پھر بھی مارچ میں یہ اچھا اور ٹھنڈا ہے۔ ہم نے ساحلوں اور ساحل سمندر پر زیر تعمیر قریبی نئے شہر کے کئی دورے کئے۔

جنوری 1998 - ہم نے کراچی کا دورہ کیا۔ اس دورے کے دوران، میں نے اپنے گھر والوں کو بتایا کہ میں اگست میں سعودی عرب چھوڑ جاؤں گا، تاکہ بچے امریکہ میں ہائی اسکول ختم کر سکیں اور وہیں کالج جا سکیں۔ میرے والد یہ سن کر بہت پریشان ہوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں سعودیہ سے اتنی بار امریکہ سے ان کے پاس نہیں جا سکوں گا۔ یہ میرا بہترین سفر تھا، کیونکہ میں اپنے والد کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے قابل تھا۔

اپریل 1998 - ہمیں یونس موتن کا فون آیا کہ میرے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ والد صاحب کے سینے کے ایکسرے کے نتائج اچھے نہیں ہیں اور مجھے گھر آنا چاہیے۔ میں نے اگلی فلائٹ کراچی لی۔ والد کا وزن کم ہو گیا تھا اور واضح طور پر وہ درد میں تھے۔ میں نے اپنے دوست ڈاکٹر محمد ظفر سے بات کی، (ڈی جے سائنس کے ایک

کلاس فیلو جنہوں نے کنگ فیصل ہسپتال میں بھی پریکٹس کی تھی)، جنہوں نے آغا خان ہسپتال میں پریکٹس کرنے والے سب سے سینئر آنکولوجسٹ ڈاکٹر مجید میمن سے ملاقات کا بندوبست کیا۔ ڈاکٹر ظفر اور میں اگلے دن اپنے والد کو ڈاکٹر میمن سے ملنے گئے۔ اس نے ایک ایک بایپسی، اور کئی لیب ٹیسٹوں اور سی ٹی اسکین کا بندوبست کیا۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور نتیجہ کا اعلان پیر، 18 مئی 1998 کو ہونا تھا۔ اس دوران میرے والد نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان کا گھر میری طلاق یافتہ بہن کے ساتھ ساتھ ان کی موت کے بعد میری والدہ کے پاس جائے۔ اپنے والد سے وعدہ کرنے کے بعد کہ میں ایک ہفتے میں واپس آؤں گا تاکہ جو بھی علاج تجویز کیا گیا ہو، میں ہفتہ کی صبح ریاض کے لیے روانہ ہو گیا۔ اگلے دن، 7 مئی، جب میں کام پر جانے کی تیاری کر رہا تھا، یونس موتن نے مجھے دوبارہ فون کیا اور میری زندگی کی بدترین خبر سنائی۔ میں نے اس صبح اپنے والد کو کھو دیا تھا۔

مجھے یاسمین اور میرے لیے اسی دن ایگزٹ انٹری ویزا کے لیے دوبارہ اپلائی کرنا پڑا۔ میں اپنے بچوں کو اپنی بیوی کے بھائی شعیب کے پاس ریاض میں چھوڑ کر کراچی آیا۔ میری ماں اور خاندان اس واقعے سے واضح طور پر غم زدہ تھے۔ میرا بھتیجا فیصل اور میرا کزن یونس مسجد میں آخری رسومات ادا کرنے میں میری مدد کے لیے کراچی میں موجود تھے۔ میرے والد صاحب کے تمام دوست مکہ مسجد میں موجود تھے جہاں ہم نے نماز کا انتظام کیا تھا۔ صدیق زکریا موتن، یونس زکریا موتن، مجید عمر موتن، امین عمر موتن، یحییٰ ہاشم باوانی، زکریا صدیق، بشیر چرا، اور بہت سے دوسرے رشتہ دار اور میرے دوست میرے والد کے انتقال پر سوگ میں موجود تھے۔ میں صدیق زکریا موتن کا اداس چہرہ کبھی نہیں بھولوں گا، جس نے مجھے پکڑ کر کندھے پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ اس نے یقینی طور پر میرے والد کو اس دن تک یاد کیا جب تک کہ وہ مر گیا۔

میں والد صاحب کے ٹیسٹ کے نتائج لینے آغا خان ہسپتال گیا۔ اگرچہ اسے پھیپھڑوں کا کینسر بڑھ گیا تھا، لیکن اس نے کبھی اپنے درد کی شکایت نہیں کی۔ وہ میرے بھانجے فیصل، بہن گل بانو (عائشہ) اور میری امی کے سامنے فجر کی نماز کے بعد خاموشی سے اس زندگی سے رخصت ہو گیئے تھے۔

میرے بہنوئی محمود کامدار، جنہیں میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں، مجھے قبرستان لے گئے۔ ابا کی قبر کو دیکھنا بہت مشکل تھا، جو اب مٹی سے ڈھکی ہوئی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ ہمارا آخری منزل تک کا سفر ہے۔ ایک دن آپ زندہ اور تندرست ہیں اور اگلے ہی لمحے آپ کو اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونا ہے۔ کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔

موت سے، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ آپ کتنے صحت مند یا امیر ہیں؟ آپ کی آخری سانسیں اس وقت لکھی گئیں جب آپ اپنی ماں کے پیٹ میں حاملہ ہوئیں۔

اس دورے کے دوران، میں نے ایک مقامی وکیل اقبال شاو کے ساتھ بھی کام کیا، لطیف شاو کے بیٹے، میرے والد کی وفات سے قبل وصیت تیار کرنے کے لیے۔ میں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ یہ شق موجود ہے کہ موجودہ گھر میری بہن عائشہ کے پاس نہیں جائے گا جب تک میری والدہ کا انتقال نہیں ہو جاتا۔ بعد کے سالوں میں یہ بہت بدقسمتی کی بات تھی جب گھر میری ماں نے بیچ دیا تھا اور پیسے ان کی بہن عائشہ اور اس کے بیٹے کے لیے امریکہ کے سفر کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر اخراجات کے لیے استعمال کیے گئے تھے۔ لیکن، اب میں سمجھتا ہوں کہ میری ماں کو ایسا کرنے کا پورا حق حاصل تھا جیسا کہ وہ اس وقت رہ رہی تھیں اور ان کی رضامندی سے، ماں پیسے خرچ کرتی ہیں جیسا کہ وہ محسوس کرتی تھیں۔ یہاں میں کہوں گا، میری بہن حسینہ بہت خوش قسمت تھیں کہ انہوں نے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے وہی گھر خریدا اور وہ اب بھی وہیں رہ رہی ہیں۔

میں نے اپنے باس حماد الدانگ کو اپنی روانگی سے ایک سال پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ میرا یہ کام کا آخری سال ہو گا، جب میرے بچے ریاض میں اپنی تعلیم مکمل کر لیں گے۔ ریاض میں سعودی امریکن انٹرنیشنل اسکول، جس میں ہمارے دونوں بچے پڑھتے تھے، صرف 9ویں جماعت تک تھی۔ ہم نے درخواست کی کہ شرمین اپنی 10ویں اور 11ویں جماعت کو منارۃ الریاض، ایک عربی-انگلش سکول سے جاری رکھے، کیونکہ نعمان جب تک اپنی 9ویں اور آخری جماعت کو ختم کر لے گا۔

ہم نے نعمان کی گریجویشن تقریب میں شرکت کی جب شرمین نے بھی گیارہویں جماعت مکمل کر لی تھی۔ یہ 1998 کے موسم گرما کی بات ہے۔ اپنے والد کو کھونے کے بعد ہم سب اب بھی افسردہ اور ملے جلے جذبات سے بھرے ہوئے تھے، اور اب ہم 13 سال سے زیادہ کام کرنے کے بعد سعودی عرب چھوڑنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ یاسمین نے ان اشیاء کو چھانٹنا شروع کر دیا جو ہم اپنے ساتھ لے جانے والے تھے اور فروخت کے لیے اشیا کا اشتہار دینا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دنوں میں، ہم نے زیادہ تر اشیاء بیچ دی تھیں جنہیں ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اپنی فور وہیل ڈرائیو کے لیے پہلے ہی ایک خریدار مل گیا تھا، جس نے مجھے جولائی 1998 کے وسط تک کار رکھنے کی اجازت دی۔

میں نے آر سی جی کے ساتھ مشاورتی پوزیشن کے لیے درخواست دی اور فون پر انٹرویو لیا گیا۔ پیشکش اچھی تھی، اور میں نے معاہدے میں بغیر سفر کی شق کے ساتھ پوزیشن قبول کی۔ میری نوکری 8 ستمبر کو شروع ہونے والی تھی، اور مجھے شاہ فیصل سے 21 ستمبر 1998 تک تنخواہ ملی تھی۔

شاہ فیصل نے مجھے نقل مکانی کے لیے ادائیگی کی اور میری پنشن بھی تیار کی۔ ہم نے نقل مکانی کرنے والی کمپنیوں میں سے ایک سے رابطہ کیا تھا، جنہوں نے گھر پر مکمل پیکنگ کے ساتھ ساتھ ایئر کارگو بھی فراہم کیا۔ انہوں نے ہمارے تمام بکس اٹھا لیے اور ہیوسٹن میں ترسیل کے لیے 21 اگست 1998 کی تاریخ فراہم کی۔

ہمیں شاہ فیصل میں ہمارے ساتھیوں نے بہت سی پارٹیوں میں مدعو کیا تھا، جس میں آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ کی ایک خوبصورت پارٹی بھی شامل تھی۔ ہم نے 8 اگست 1998 کے لیے ہیوسٹن کے لیے اپنی پروازیں بک کروائی تھیں۔ میں نے اپنے بھائی اشرف کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اور ان سے کہا تھا کہ وہ شہر کے شمال مغربی حصے میں ایک گھر پر نظر رکھیں، جہاں ہم سعودی عرب جانے سے پہلے مقیم تھے۔

# CHAPTER 8

## 1998 TO PRESENT

ہماری فلائٹ وقت پر ہیوسٹن پہنچ گئی، اور میرے بھائی اشرف کی فیملی ہمارے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھی۔ ہم ان کے ساتھ ان کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرے، جو شہر کے شمالی حصے میں بھی تھا۔

اگلے دن، ہم نے اور کرک ووڈ پر اپنا اپارٹمنٹ بک کیا۔ اشرف نے ہمیں شہر کے اس حصے میں بہت سے گھر دکھانا شروع کیے، لیکن، کسی نہ کسی طرح، ان میں سے کوئی بھی ہمارے خاندان کے لیے موزوں نہیں تھا۔ ہم نے 14,000 ڈالر کیش میں ایک نئی گاڑی نیسان خریدی، جو مناسب قیمت لگ رہی تھی۔ اب ہم مکمل طور پر آزاد تھے۔ ہم نے اپنے بچوں کو لینگھم کریک ہائی اسکول میں بھی رجسٹر کیا، جو اگست 1998 کے چوتھے ہفتے میں شروع ہوا تھا۔ اب میں اپنے دونوں بچوں کو اسکول چھوڑنے کے ساتھ ساتھ 3 بجے کے قریب انہیں اٹھانے میں مصروف تھا۔

یاسمین ویسٹ لٹل یارک اور ایڈکس سنتسوما کے قریب سوانا اسٹیٹس میں ایک انوینٹری گھر تلاش کرنے میں کامیاب رہی۔ وہ گھر ان گھروں سے بہتر لگ رہا تھا جو ہم نے اب تک دیکھے تھے۔ یہ ایک نئے سب ڈویژن میں ایک نیا گھر تھا، جس کی قیمت ایک لاکھ چون ہزار ڈالر تھی۔ میں نے بلڈر سے درخواست کی کہ وہ میرے بھائی کو بطور رئیلٹر لسٹ کرے تاکہ وہ کمیشن حاصل کر سکے۔ ہم نے کافی نیچے ادائیگی کی اور رہنے کے منظور ہونے کا انتظار کیا۔ ہمارے ڈاون پیمنٹ اور بینک اکاؤنٹ نے قرض کی منظوری کو یقینی بنایا، اور ہم 1 ستمبر 1998 کو اپنے نئے گھر میں چلے گئے۔ اب اسکول کی بس میرے بچوں کو اٹھا کر چھوڑے گی۔

فنگر کے فرنیچر کی دکان کے چند دوروں اور فروخت دیکھنے کے بعد، ہم نے اپنا تمام فرنیچر خرید لیا۔ اب ہم صرف سعودی عرب سے اپنی دوسری چیزوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے اپنا کام 8 ستمبر 1998 کو آر سی جی کنسلٹنگ کے ساتھ شروع کیا۔ گاڑی چلانے کے پہلے چند دن میرے لیے کچھ عجیب نہیں تھے، کیونکہ میں سعودی عرب میں کام کے لیے پیدل چلنے کا عادی تھا۔ اب، یہاں تک کہ اگر مجھے صرف ایک روٹی کی ضرورت تھی، مجھے اسے حاصل کرنے کے لئے گاڑی چلانا پڑتی تھی۔

ہمیں اپنے نئے گھر میں منتقل ہونے کے دو ہفتوں کے اندر سعودی عرب سے ہماری کھیپ موصول ہو گئی۔ ہم سب اپنا سامان کھولنے اور نئے گھر میں سیٹ کرنے میں مصروف تھے۔ کھیپ میں کچھ بھی نہیں کھویا تھا، سوائے کچھ خاص ایشیائی جھاڑو کے۔ ہم نے نماز کے لیے خودکار اذان پہلے ہی ترتیب دے رکھی تھی، تاکہ ہم اپنی نماز وقت پر ادا کر سکیں۔ ہم نے کئی سالوں کے منقطع ہونے کے بعد اپنے بہت سے دوستوں سے ملنا شروع کیا۔ گھر واپس آکر ہمیں بہت اچھا لگا۔ میں، شرمین نے ہائی اسکول سے گریجویشن کیا

میں نے اپنی نیسان کی جگہ ایک نئی آلیرو گاڑی لے لی، اور کچھ دنوں بعد یاسمین کے لیے ایک وین خریدی۔ اس نے شرمین کو یاسمین کے پرانی فورڈ ایسکارٹ پر گاڑی چلانے کا طریقہ سکھانے کا ایک اچھا موقع فراہم کیا۔ اس نے بہت جلد سیکھ لیا اور جلد ہی اس کا ڈرائیونگ لائسنس حاصل کر لیا۔ شرمین نے ہیوسٹن یونیورسٹی میں بھی درخواست دی اور انڈرگریجویٹ ایم آئی ایس پروگرام میں داخلہ لیا۔ نعمان کے پاس ہائی اسکول ختم کرنے اور کالج کی تیاری کے لیے مزید دو سال تھے۔ اس نے 10 جون 1999 کو اپنی سالگرہ کے موقع پر اپنا لائسنس بھی حاصل کیا تھا۔ ہمیں اسے ایک پرانے ماڈل کی کار خریدنی تھی۔ اب میں چار کاروں کی انشورنس کے ساتھ ساتھ میڈیکل اور ہوم انشورنس بھی ادا کر رہا تھا۔ اس دوران بچے سعودی عرب جانا چاہتے تھے۔ سابق باس اور بہنوئی شعیب کی مدد سے، ہم نے ویزا حاصل کیا اور ریاض میں کچھ وقت گزارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم نے عمرہ ادا کیا اور مدینہ منورہ کی سیر کی جب ہم وہاں تھے۔ ہم بچوں کے اسکول شروع کرنے کے وقت پر واپس آئے۔

ابتدائی طور پر، مجھے بینک آف امریکہ کے ساتھ سال 2000 کا پروجیکٹ تفویض کیا گیا تھا، اور بعد میں، سال 2000 کی تیاری میں ان کی مستعدی کے لیے مجھے میموریل ہرمن کو تفویض کیا گیا تھا۔

مجھے میموریل کے ساتھ مستقل عہدے کی پیشکش کی گئی، جسے میں نے قبول نہیں کیا۔ کسی وجہ سے جیسا کہ میں نے آر سی جی کا وفادار محسوس کیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ جلد ہی یہ منصوبہ ختم ہو گیا، اور مجھے یکم جنوری 2000 ،کے آخر تک میری تنخواہ کا چیک دیا گیا

جنوری 2000۔ دوسری بڑی غلطی جو میں نے کی وہ اپنے دیرینہ دوست رفیق لویا کے ساتھ کی سرمایہ کاری تھی۔ بعد میں، مجھے پتہ چلا کہ وہ احمقانہ بہانے بناتے ہوئے میرے چیک کیش کر رہا تھا اور اپنا قرض ادا کر رہا تھا۔ اس نقصان نے میری بچت پر کافی حد تک نقصان پہنچایا کیونکہ میں نے پہلے ہی گھر پر بھاری رقم ادا کی تھی، چار کاریں اور فرنیچر خریدا تھا۔ اب ۔میں بے روزگار تھا اور صرف بیروزگاری جمع کر رہا تھا

ہر روز میں بہت سے ہسپتالوں کے آئی ٹی ڈیپارٹمنٹس میں کام کے لیے درخواست دینے میں مصروف تھا، لیکن کوئی بھی نئے عملے کی تلاش میں نہیں تھا، کیونکہ متوقع سال 2000 کے مسائل کبھی بھی مکمل نہیں ہوئے، جس سے مارکیٹ ۔میں آئی ٹی کے پیشہ ور افراد کی بھرمار تھی

میں دو مہینوں کے بعد مایوس تھا اور مئی 2000 میں ہیرس کاؤنٹی ہسپتال ڈسٹرکٹ میں کم تنخواہ والے ایپلی کیشنز مینیجر کا عہدہ قبول کر لیا۔ میرے لیے یہ کام انتہائی آسان تھا، کیونکہ میں صحت کی دیکھ بھال کی تمام درخواستوں اور ورک فلو کو جانتا تھا۔ دو مہینوں کے اندر، مجھے سی آئی او کے دفتر میں بلایا گیا اور ہسپتال کے تمام ذیلی شعبوں کی نگرانی کے لیے ایک انتظامی عہدہ پیش کیا۔ یہ ایک چیلنجنگ پوزیشن تھی، جس میں میں لیبارٹری/پیتھالوجی، فارمیسی، ریڈیولاجی، کارڈیالوجی، پلمونری لیب، جی آئی لیب، اور کئی دیگر چھوٹے شعبوں کا ذمہ دار بن گیا۔ شروع میں، مجھے ایک فارمیسی سپورٹ پرسن دیا گیا۔ لیب اور ریڈیالوجی میں ان کا اندرونی آئی ٹی سپورٹ عملہ تھا، اور مجھے میرے سی آئی او نے ان علاقوں کو اپنے سیکشن میں یکجا ۔کرنے کو کہا

لویا نے کبھی بھی ان کے فون کالز کا جواب نہیں دیا، جان بوجھ کر مجھ سے گریز کیا۔ آخر کار وہ ایک دن ظاہر ہوا، بہت سے چیک لکھ کر مجھ سے کہا کہ وہ انہیں صرف مخصوص مہینوں میں جمع کروائیں اور صرف اس کے بعد جب اس نے فون ۔کیا اور مجھے ایسا کرنے کو کہا

اس دوران نعمان نے اپنا ہائی اسکول ختم کیا اور کالج کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلے کی منظوری بھی حاصل کی اور اگست 2001 میں اپنے نئے سال کا آغاز کیا۔

لویا ایک اور شخص فاروق صمد کے ساتھ 2.5 ملین میں اپارٹمنٹ کمپلیکس خریدنے کی تجویز لے کر واپس آئے۔ مجھ سے کوئی ڈاون پیمنٹ کرنے کے لیے نہیں کہا گیا، بلکہ، کارپوریشن کا صدر بننے کو کہا گیا۔ انہوں نے ہر ماہ منافع کو تین طریقوں سے تقسیم کرنے کا وعدہ کیا۔ ان دونوں نے دعویٰ کیا کہ ایک بار جب ہم نے ایک دو سالوں میں کمپلیکس بیچ دیا تو ہم اچھی رقم کمائیں گے اور لویا میرا قرض اور فروخت میں میرا منصفانہ حصہ ادا کرے گا۔ کئی مہینوں سے مجھے وعدے کے مطابق ادائیگیاں موصول ہوئیں، اس لیے کم از کم مجھے اپنے پیسے واپس مل رہے تھے۔ تاہم 18 ماہ بعد وہ بہانے بنانے لگے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم اپنے قبضے کی شرح سے کم ہیں اور ہم پیسے کھو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کمپلیکس میں دو قتل کی بھی اطلاعات تھیں۔ چند ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ اپارٹمنٹ کمپلیکس 3.4 ملین ڈالر میں فروخت ہوا تھا۔ فاروق صمد کسی بھی فون کال کا جواب نہیں دیتے تھے اور میں حیران تھا کہ کارپوریشن کا صدر ہونے کے ناطے مجھ سے سیل کے حوالے سے کسی کاغذات پر دستخط کرنے کو بھی نہیں کہا گیا۔ لویا اور مجھے اس دفعہ فاروق نے ہم دونوں کو دھوکہ دیا۔

وکیلوں میں سے ایک کے ساتھ صورتحال پر تبادلہ خیال کیا۔ وکیل نے ہمارے ساتھ جائزہ لیا۔دستاویزات جو پوری کہانی کو بیان کرتی ہیں۔ میں اصل لین دین میں دو ماہ سے صدر نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا سارا منافع کمایا اور ہمیں چلتا کیا۔

میں اس دوران، لویا کبھی کبھار 200 یا 250 ڈالر کی ادائیگی کرتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ قانونی مقدمہ کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے ہر چند ماہ بعد یہ ادائیگیاں کر رہا تھا۔ اس نے مجھ پر تقریباً $87,000 واجب الادا ہیں، ادائیگیوں کو کم کرنے کے بعد جو میں نے اپارٹمنٹ سے وصول کیا تھا۔

مجھے اپنے کام پر اچھی تنخواہ ملی اور میں عہدے اور ذمہ داری سے بہت خوش تھا۔ صرف خرابی یہ تھی کہ میں اس کام کے لیے کانفرنسوں میں کوئی کاغذات جمع کرنے سے قاصر تھا جو ہم ہیرس میں کر رہے تھے۔ تاہم، مجھے ہر سال 38 دن کی تنخواہ کی چھٹی مل رہی تھی اور میں سعودی عرب اور پاکستان میں چھٹیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

میرے اعتراضات کے باوجود اس دوران میری امی، عائشہ اور اس کے بیٹے فیصل کے ساتھ امریکہ چلی گئیں۔ ابتدائی طور پر، وہ شکاگو میں رہتے تھے. بعد میں، وہ بالٹیمور، میری لینڈ، میں چلے گئے۔

MY MOM'S VISIT TO HOUSTON:

2001 میں، ہماری زندگیوں میں بہت سی نئی چیزیں اچھے کے لیے رونما ہوئیں۔ یاسمین ہمارے اس گھر سے خوش نہیں تھی جو ہم نے اتنا نیچے اور رئیل اسٹیٹ فیس ادا کرنے کے بعد خریدا تھا۔ وہ کسی بہتر جگہ کی تلاش میں تھی جہاں وہ اپنی پسند کا گھر بنا سکے۔ ایک دن شرمین گھر آئی اور ہمیں بتایا کہ اس نے ایلڈریج اور ویسٹ لٹل یارک کے قریب ایک جگہ دیکھی ہے جہاں انہوں نے سنگ بنیاد کا کام شروع کیا تھا۔ میں حیران تھا کیونکہ یہ شہر کے اندر ایک جگہ تھی، جہاں زمین تلاش کرنا مشکل تھا۔

ہم شام کو اس جگہ کو دیکھنے گئے اور یقیناً، کسی کا فارم ایک خوبصورت سب ڈویژن میں تبدیل ہو رہا تھا جس کے بیچ میں ایک جھیل تھی۔ اس کو مزید باریک بینی سے دیکھنے کے بعد، ہم نے ویسٹ لٹل یارک کے قریب ترین گلیوں میں سے ایک پر چار بیڈ روم کا گھر بنانے کا فیصلہ کیا۔ کلڈیسک پر واقع، گھر کی تعمیر میں ہمیں دو لاکھ پچاس ہزارلاگت آئی، بشمول وہ تبدیلیاں جو ہم چاہتے تھے۔ جب ہم گھر آئے تو ہم نے یہ دیکھنا شروع کیا کہ جھیل پر کیا خرچ آئے گا۔ قیمت کا فرق تقریباً پچاس ہزارتھا۔ ہم نے آخرکار جھیل لاٹ اور 3695 ماڈل کے لیے بقرہ عید کی نماز ادا کرنے کے بعد معاہدے پر دستخط کر دیے۔

ہمیں ایک ریئلٹر ملا جس نے ہمارا موجودہ گھر بیچنے کے لیے رئیل اسٹیٹ فیس میں 1.5٪ سے کم چارج کرنے کی پیشکش کی اور بلڈر سے رئیل اسٹیٹ فیس وصول کرنے کے بعد ہمیں نئے گھر سے 2500 ڈالر ادا کرنے کی پیشکش کی۔ لہذا، مجموعی طور پر، ہم نئے گھر میں جا کر پیسہ کما رہے تھے۔ جب ہمارا گھر بن رہا تھا تو ہم چھٹیوں پر کراچی چلے گئے۔

جب ہم واپس آئے تو گھر تیار تھا اور ہم نے ستر ہزار ڈالر کے قریب ڈاون پیمنٹ کے طور پر اور 15 سال کا رہن لینے کے بعد اپنے رہن کے کاغذات پر دستخط کیے تھے۔ راستے میں، میں نے کچھ احمقانہ غلطیاں کیں، دو بار ری فنانسنگ کروائی،

ایک بار لچکدار شرح پر رہن حاصل کرنے کے لیے اور دوبارہ صرف 10 سال کے لیے کم مقررہ شرح پر واپس جانا۔ ایک بار پھر، آپ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔ اس بار، کم از کم میں 15 سال کی بجائے 10 سالوں میں جلد ادائیگی کرنے کے قابل تھا۔

اسی سال نعمان نے ہائی اسکول سے گریجویشن کیا۔

ہمارے سی ای او اور سی آئی او کے درمیان، پراجیکٹس کا انتظام کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ نئی سی آئی او اپنے دو سالہ مشاورتی معاہدے کو مکمل کرتے ہوئے سسٹم کو ایسے ہی برقرار رکھنا چاہتی ہے۔

جب فلپ بریڈلی 2003 میں قائم مقام سی آئی او بنے، تو ہم نے ایک بار پھر دیکھ بھال اور نئے منصوبوں دونوں پر کام کرنا شروع کیا۔ اس دوران شرمین نے دو ڈگریوں کے ساتھ گریجویشن کیا، ایک بی ایس فنانس میں اور ایک بی ایس ایم آئی ایس میں ہیوسٹن یونیورسٹی سے۔ اس کا کانووکیشن اسی عمارت اور اسی جگہ 2003 میں منعقد ہوا تھا جیسا کہ 1977 میں میرے لیے تھا، جب میں نے کمپیوٹر سائنس میں میجر کے ساتھ نیچرل سائنس اور ریاضی کے شعبہ سے گریجویشن کیا۔
شرمین نے نیٹ ورکنگ ڈیپارٹمنٹ میں کام شروع کرنے کے بعد، اس کے آخری سمسٹر میں اسے ایک بڑی کمپنی نے کل وقتی ملازم کے طور پر رکھ لیا۔

کچھ سال بعد، ٹم ٹنڈل، جو ہمارے کنسلٹنگ کنٹریکٹر تھے جب میں نے کمپنی میں شمولیت اختیار کی تھی، مستقل سی آئی او کے طور پر واپس آئے، جبکہ فلپ ایپلی کیشن سپورٹ کے باس بن گئے۔

فلپ اور ٹم کے تحت، ہم نے ایپک ایپلی کیشنز کو انسٹال کرنے کے لیے کئی بڑے پروجیکٹ شروع کیے۔ زندگی مصروف تھی، اور جب آپ مصروف ہوتے ہیں تو آپ کو چھٹیاں لینا پڑتی ہیں۔ ہم سعودی عرب میں اپنی چھٹیاں گزارنے کے ساتھ ساتھ ریاض میں سسرال میں جانے کے ساتھ ساتھ شاہ فیصل سے میرے اور وہاں کے آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ میں میری سابقہ ٹیم کے ساتھ۔ ان تعطیلات نے ہمیں مکہ مکرمہ میں عمرہ اور مدینہ منورہ میں زیارت کا موقع بھی فراہم کیا۔ ہم ہر دوسرے سال سعودی سفر کرتے اور تقریباً ہر سال کراچی جاتے۔ خوش قسمتی سے ہمارا گھر کراچی میں تھا۔ زیادہ تر وقت ہم ہوائی

اڈے سے اپنے گھر تک ٹیکسی لیتے تھے۔ کئی بار یاسمین کی بہن بانو ماں اور اس کے شوہر اقبال موتی آکر ہمیں اٹھا لیتے ۔لیکن ہم نے پوری کوشش کی کہ کسی کو پریشان نہ کریں

جب نعمان کالج میں پڑھ رہا تھا، شرمین نے بتایا کہ توصیف کے گھر والے، جو اس کے ایک دوست ہیں، ہم سے ملنے آنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک حیرت کی بات تھی، کیونکہ اس نے ابھی پہلے کی دوستی سے بہت بڑا سبق سیکھا تھا۔ شرمین کے ساتھ گریجویشن کے دوران ہم لڑکے اور خاندان سے ملے تھے اس لیے ہم نے ان کے خاندان کو اپنے گھر بلایا۔ ہم سب نے اپنے اگلے سفر کے دوران کراچی میں توصیف کی فیملی سے ملنے کا فیصلہ کیا، لیکن، اس دوران، شعیب (یاسمین کے بھائی) اور ۔ان کے اہل خانہ سے کہا کہ وہ طارق بھائی اور ان کے اہل خانہ سے ملاقات کریں کیونکہ وہ اس وقت کراچی میں تھے

اگرچہ شعیب کی رپورٹس کافی سازگار تھیں لیکن میں دو وجوہات کی وجہ سے بہت خوفزدہ تھا، ایک تو شرمین کا سابقہ منگنی میں برا تجربہ اور دوسرا یہ کہ خاندان کے لوگ غیر میمن تھے، حالانکہ میں یہاں دہرانا چاہتا ہوں کہ میں بہت سے لوگوں سے متفق نہیں ہوں۔ میمن خاندانوں میں ثقافتی رسومات، بشمول ساس بہو کے مسائل۔ جب کہ استخارہ میں جواب بہت مثبت ۔تھا، ہم نے شرمین کو بھی استخارہ کرنے کو کہا

ہم پاکستان گئے، جہاں طارق بھائی نے گالف کلب میں مدعو کیا۔ ہمیں پہلے معلوم ہوا تھا کہ طارق بھائی پاکستان آرمی کے ایک اہم رکن تھے اور درحقیقت ایک لیفٹیننٹ جنرل تھے، جو کراچی کے کور کمانڈر کے طور پر تعینات تھے۔ یہ ایک بہترین اجتماع تھا، اور ہم گھر والوں سے بہت متاثر ہوئے۔ شادی کی تجویز قبول کر لی گئی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ نکاح ۔اور شادی ایک سال بعد ہیوسٹن اور ولیمہ کراچی میں ہو گا

شرمین کی منگنی - نکاح، ہیوسٹن ستمبر 2004 کو طے ہوا۔ ہیوسٹن میں طارق بھائی اور افشاں بھابھی کے ساتھ نکاح کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ ہم سب ہیوسٹن کے جنوب مغربی حصے میں سعیدہ کی شادی ہال دیکھنے گئے۔ سب نے اتفاق کیا کہ ۔ہال دو سو مہمانوں کے لیے کافی بڑا تھا۔ وہ دن آگیا جب میری پیاری بیٹی کی شادی ہونے والی تھی

ہم اپنی مرسڈیز میں وقت پر ہال پہنچے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دولہا اور اس کے اہل خانہ پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ یہ ہمارے خاندانوں کا ایک بہت اچھا اجتماع تھا۔ بدقسمتی سے، میرے بھائیوں میں سے ایک (وہی شخص جس

نے کچھ اٹھایا۔ میرے اور میرے خاندان کے خلاف نامعلوم رنجش نے میرے خاندان کو نکاح اور شادی میں شرکت سے روکنے کی دھمکی دی۔

میرا بھائی اشرف اور اس کا خاندان میرے خاندان کے واحد حاضرین تھے۔ یہ ایک اور سبق سیکھا گیا: اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ آپ خاندان کے لئے کتنا ہی کرتے ہیں، ہمیشہ ایک ایسا رکن ہوگا جو آپ کی حیثیت، تعلیم، یا خوش قسمتی سے حسد کرے گا اور آپ کو نیچا دکھانے کی کوشش کرے گا۔

2005: کراچی، پاکستان میں شرمین کا ولیمہ، 6 اگست

طارق بھائی اور افشاں بھابھی نے توصیف اور شرمین کے ولیمہ کے لیے گولف کورس بک کرایا تھا۔ ہم نے اپنی طرف سے سب کو ولیمہ میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ میری تمام بہنوں اور ان کے اہل خانہ نے شرکت کی۔ میرے بھائی اشرف اور اس کے خاندان کو، جنہوں نے شرمین کے نکاح اور شادی کے انتظامات میں مدد کی تھی، کو بھی کراچی میں ولیمہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ وہ اور ساتھ ہی ساتھ میرے اسکول کے بہت سے دوست بھی ہمارے ساتھ آئے۔

ہم جولائی 2007 میں کراچی، پاکستان کا دورہ کرنے گئے تھے۔ اس سفر میں ہم نے اپنے بچوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اپنے دورے کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ میری پہلی کتاب یحییٰ ہاشم باوانی لکھنے میں میری مدد کرنے والے رہنما یحییٰ ہاشم باوانی کا انتقال ہو گیا ہے۔ زکریا صدیق مجھے اپنے گھر لے گئے، اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ اپنے دوست یحییٰ بھائی کے لیے تھوڑی سی دعا کے لیے بیٹھ گئے۔ بدقسمتی سے، مجھے ان کی آخری کتاب کی کاپی نہیں ملے گی، جو میمن کے اسکرپٹ پر لکھی تھی۔ تاہم، میرے پاس اس کے دستاویزات کی ایک کاپی ہے، جو اس نے مجھے دینے کے لیے کافی مہربانی کی۔ یحی بھائی ایک بہت ہی باشعور انسان تھے، اور ان کی کمی ہمیشہ رہے گی۔

کراچی میں زمانے کے دوران، زکریا صدیق نے مجھے ہمارے جیت پور میمن ایسوسی ایشن اسکول میں ایک تقریب میں شرکت کی دعوت دی، جہاں مجھے اسکول کے طلباء اور اساتذہ سے مختصر تقریر کرنے کو کہا گیا۔ میں نے 1963 کے اپنے سب سے پرانے رپورٹ کارڈ کی ایک کاپی لی اور دکھایا۔ دستاویز میں نے اپنی مختصر تقریر کی۔ اس سے پرنسپل، اساتذہ اور طلباء کو بہت متاثر ہوئے۔

۔ہم کچھ کلاس رومز کو دیکھنے گئے جہاں ہم پڑھا کرتے تھے۔ ہمیں بعد میں ایک اچھا لنچ دیا گیا

فنکشن میں ڈاکٹر سائرہ بانو صاحہ سے ملاقات ہوئی۔ سائرہ بانو کالسوفٹ کمپنی کے لئے کام کرتی تھیں ۔ مجھ تقریر کرنے کا ۔بھی موقعہ دیا گیا

ڈاکٹر سائرہ بانو نے مجھے کالسوفٹ سے فون کیا اور دورے کی تاریخ تجویز کی، جس پر میں نے رضامندی ظاہر کی۔ میرا ۔انٹرویو شائع ہوا، اور مجھے ایک تختی پیش کی گئی

میں اب چھٹیاں لینے کے قابل تھا جس کے دوران میں پاکستان میں اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ ساتھ سعودی عرب میں ۔اپنی ساس سے ملنے گیا

ہمارے واپس آنے کے بعد، توصیف اور شرمین نے ہیوسٹن میڈیکل سینٹر میں اپنی اپنی جگہ، ایک عمدہ کنڈومینیم خریدا۔ ایک رات انہوں نے ہماری حیرت اور خوشی کے ساتھ اعلان کیا کہ شرمین کی توقع ہے اور اس کی مقررہ تاریخ 26 دسمبر ۔2007 ہے۔ توصیف کے والدین کو بھی اطلاع کر دی گئی۔ ہر کوئی نئی آمد کی توقع میں بہت خوش اور پرجوش تھا

طارق بھائی اور افشاں بھابی 2007 کے آخر میں ہیوسٹن پہنچے اور ہم سب نے شرمین کو لاڈ کرنا شروع کر دیا۔ 21 دسمبر 2007 کو، منصوبہ بندی سے ایک ہفتہ پہلے، وہ ہسپتال میں تھی، کسی بھی وقت آمد کی توقع تھی۔ ایک بار پھر، ہم نے اپنے قریبی خاندان کے رکن اشرف اور ان کے اہل خانہ کو بھی وہاں آنے کی اطلاع دی۔ ہماری نواسی تیشا نور آخر کار آ گئی، ۔اور یہ ہماری زندگی کا بہترین لمحہ تھا۔ ہم شرمین سے پوچھنا بھی بھول گئے کہ وہ کیسا محسوس کر رہی تھی

میں ایک بار اپنی ماں سے ملنے گیا تھا جب وہ بالٹی مور میں میری بہن عائشہ کے ساتھ تھیں۔ یہ وہی بہن تھی جس نے میرے ایک بھائی کے ساتھ صرف اس وجہ سے اپنے خاندان کے خلاف جانے کا فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنی ماں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ پا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری بیوی کئی سرجریوں سے گزر چکی ہے اور اس کے اپنے مسائل ہیں، اسے میری اور نعمان کی مدد کی ضرورت ہے۔ حالات کے پیش نظر، میری ماں کی دیکھ بھال کرنا ناممکن تھا، جنہیں اس وقت مسلسل توجہ کی ضرورت تھی۔ دوسری بار میں ماں سے ملنے بفلو گیا، جہاں وہ میرے چھوٹے بھائی ابراہیم کے خاندان کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ہر بار اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اسے میری بہن یاسمین کے ساتھ رہنے

کے لیے پاکستان واپس بھیج دیا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ یہاں امریکہ میں مرنا نہیں چاہتی۔ وہ ایک صندوق میں دفن ہونے سے ڈرتی تھی اور اپنی بقیہ زندگی میری بہنوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھ سے اپنے بھتیجے کے ٹکٹ کے دونوں پیسے ادا کرنے کو کہا، جو اسے کراچی لے جائے گا۔ اس نے یہ بھی درخواست کی کہ مجھے ماہانہ بنیادوں پر اس کی مالی امداد نہیں روکنی چاہیے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ اور میں نے کبھی ایسا نہیں کیا، یہاں تک کہ جب اسی بھائی نے ساری صورت حال کو توڑ مروڑ کر میری بیوی کو مورد الزام ٹھہرایا، بجائے اس کے کہ وہ میری ماں کی مدد کر سکے، جو وہ کرنے کے قابل تھا۔ اس دنیا کا یہی طریقہ ہے۔ ہر کوئی اپنے فائدے کا سوچتا ہے، اور ہماری ثقافت آج بھی ہندو ثقافت کی باقیات رکھتی ہے، جس میں یہ رواج ہے کہ بڑے بیٹے کو والدین کو اپنے خاندان کے ساتھ رکھنا چاہیے۔ اسلام یقینی طور پر کسی بھی طرح اس پر مجبور نہیں کرتا۔ درحقیقت، تمام بچے، بیٹے یا بیٹیاں، اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ ایک محفوظ جگہ فراہم کرکے ان کی دیکھ بھال کرنے کے ذمہ دار ہیں، یا، کم از کم، مالی امداد کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ آرام دہ ہیں۔ دکھ ہوا جب میری والدہ نے اپنے آخری دنوں میں مجھے بتایا کہ میرے علاوہ کسی بھائی نے بھی ان کی مالی مدد نہیں کی۔ وہ کہتی رہی کہ اس کے پاس مجھ سے کافی پیسے ہیں لیکن وہ بہتر محسوس کرتی اگر اسے ماہانہ 50 ڈالر اضافی بھی دیے جاتے۔ کون اپنے والدین کی کفالت کے لیے ماہانہ 50 ڈالر نہیں دے سکتا؟ اس کے بجائے، اسی بھائی نے میری بیوی کو ای میلز لکھنے اور پورے خاندان کو کاپی کرنے کا انتخاب کیا۔ یہ شرم کی بات ہے ۔کہ اس میں کبھی بھی مجھ سے آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنے یا کم از کم ہماری ماں کی مدد کرنے کی ہمت نہیں ہوئی

مجھے کبھی برا نہیں لگے گا کیونکہ اللہ کی نظر میں میں نے اپنی بیوی کی بڑی مدد سے اتنی بچت کی کہ میرے والدین آرام سے زندگی گزار سکیں۔ ایک بار پھر، یہ صرف اگلی نسل کو رہنمائی فراہم کرنے کے لیے ہے، جنہیں یہ سوچنا چاہیے کہ جب آپ چھوٹے بچے تھے، جب آپ بیمار تھے یا جب آپ اندھیرے سے ڈرتے تھے تو آپ کے والدین نے آپ کے لیے کیا کیا تھا۔ انہوں نے وہ سکون فراہم کیا جس کی آپ کو ساری زندگی ضرورت تھی۔ اس کے باوجود، جب آپ کی عمر 32 سال ہے اور ۔آپ شادی شدہ ہیں اور آپ کے دو بچے ہیں، تو آپ کی پہلے سے محدود آمدنی کو بانٹنا بہت مشکل ہے

لیکن اللہ کے فضل سے جب آپ اپنے والدین کے لیے زیادہ خرچ کرتے ہیں اور اپنی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کی دولت کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے جس کا آپ کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ میری پوری زندگی میں، مجھے زیادہ سے

زیادہ مہیا کیا گیا، اور اس کا فضل آج بھی ریٹائرمنٹ میں جاری ہے۔ یہ یقینی طور پر اللہ کی رحمتوں اور بہت سی دعاؤں کی وجہ سے ہے جو آپ کے والدین نے آپ کے لیے کی ہیں۔

2009 میں عید الفطر کے موقع پر خاندان کا ایک اچھا اجتماع تھا، اور میرے بھائی اشرف اور ان کے خاندان نے ہمارے ساتھ عید کا لطف اٹھایا، جیسا کہ وہ ہر سال کرتے تھے۔ تاہم، بدقسمتی سے، یاسمین کے گھٹنے کی بڑی سرجریوں کی وجہ سے، ہم دوران عید قریبی خاندان سے باہر خاندان کے افراد کو مدعو نہیں کر سکے۔ کوئی باہمی دعوت بھی نہیں دی گئی۔

سال 2010 ہمارے لیے بہت مشکل تھا۔ ہمارے بیٹے نعمان نے خود سے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اپنی زندگی میں بہت سے چیلنجز کا سامنا تھا اور میرے اور یاسمین کے لیے یہ بہت مشکل تھا۔ ہم نے ہمیشہ اللہ سے اپنے لیے اور اس کے لیے ہدایت مانگی۔ میں ان واقعات کو سچائی کے ساتھ ایک بار پھر اس امید پر لا رہا ہوں کہ آنے والی نسلیں ان سے سبق حاصل کریں گی۔ ہر خاندان کے اپنے مسائل ہوتے ہیں، لیکن شاذ و نادر ہی کسی میں ہمت ہوتی ہے کہ دوسروں کی روشن خیالی کے لیے ان کا ذکر کرے۔ ہمارے خاندان کو ہماری مشکلات کا سامنا تھا، لیکن میں کبھی بھی اللہ کا شکر پوری طرح سے ادا نہیں کر سکوں گا کہ اس نے ہمیں جو کچھ دیا، ہمارے اور ہمارے بچوں اور نواسے نواسیوں کے لیے ایک حقیقی خوشگوار زندگی۔ اللہ کی طرف سے خالص امتحان یہ ہے کہ ہم کس قدر مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔

پیپر: ڈاکٹر جان رگس، ہمارے میڈیکل ڈائریکٹر ہمیشہ اس بات سے متاثر رہے ہیں کہ ہم نے کس طرح بہت سے سسٹمز میں ڈسپلے EPIC ،کے نتائج کے انضمام کو مکمل کیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تصاویر کو اپنی میڈیکل ریکارڈز ایپلی کیشن کیا۔ ہم دونوں نے ایک مقالہ کرنے اور اسے اپنی اگلی کانفرنس میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے پیپر اور پریزنٹیشن تیار کی اور اس نے ایڈٹ کر کے پیش کیا۔ اس کی منظوری دی گئی۔ ڈاکٹر رِگز نے مقالہ پیش کیا جبکہ میں نے تمام تکنیکی سوالات کے جوابات دیے اور اسے کانفرنس میں اچھی طرح سے قبول کیا گیا۔

جولائی 2013 میں، ہیرس ہیلتھ سسٹم کو ہیلتھ کیئر کے سب سے زیادہ وائرڈ ونر 2013 سے نوازا گیا اور میں نے اپنے کے ساتھ تقریب میں شرکت کی۔ یہ ایوارڈ مجھے میرے باس نے میری ریٹائرمنٹ پر دیا تھا اور اب میرے ہوم آفس CIO میں اس کا گھر ہے۔

:2013 ،کارڈیک سرجری - نومبر

جب میں اور یاسمین نے 1985 سے شام میں چلنا شروع کیا۔ ہم نے سوچا کہ ہم بہتر صحت میں ہیں۔ 2013 میں ایک دن یاسمین کو اپنے بائیں بازو میں درد محسوس ہوا۔ ہم نے کئی بار کارڈیک فزیشنز سے مشورہ کیا لیکن کوئی بھی علامات کی تشخیص نہیں کر سکا۔ ایک بار پھر، درد نے اپنی رفتار برقرار رکھی اور ہم نے اسے ایکو سے ٹریڈمل اور نیوکلیئر ایم آر آئی ٹیسٹ شروع کر دیے۔ اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور بہتر نتیجہ پر اصرار کیا۔ کارڈیک فزیشن نے آخر کار کیلشیم سکور ٹیسٹ کے لیے درخواست کی جس نے یہ چال چلی اور کارڈیک کیوٹرائزیشن کے لیے کافی جواز فراہم کیا۔ نتائج بہت مثبت تھے، 98٪ مرکزی شریان میں رکاوٹ تھی جبکہ دیگر تقریباً 80٪ تھے۔ وہ فوری طور پر روبوٹک کارڈیک سرجری کے لیے مقرر تھی۔ اس تکنیک کی سفارش کی گئی تھی کیونکہ خیال یہ تھا کہ چوٹ کو کم سے کم رکھا جائے اور تیزی سے صحت یابی فراہم کی جائے۔

وہ دن آیا، 18 نومبر، 2013 اور ہم وہاں میتھوڈسٹ ہسپتال، میڈیکل سینٹر میں بہترین کارڈیک سرجن کے تحت تھے۔ سرجری اچھی طرح سے ہوئی اور اسے مکمل ہونے میں تقریباً 6 گھنٹے لگے اور انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا۔ میں اس رات گھر آیا، کھانا کھا کر سو گیا۔ اگلی صبح سویرے بیدار ہوا اور جب میں ہسپتال جانے کی تیاری کر رہا تھا تو ہسپتال سے فون آیا۔ جب میں نے فون کا جواب دیا تو دوسری طرف کارڈیک سرجن تھا جو تھوڑا گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے وضاحت کی کہ یاسمین کی ای کے جی غیر معمولی تھی اور وہ اسے اس غیر معمولی ای کے جی کی وجہ جاننے کے لیے اسے کارڈیک کیوٹرائزیشن کے لیے آپریٹنگ روم میں لے جا رہے تھے۔

میں فوراً ہسپتال پہنچا۔ میں میتھوڈسٹ ڈاکٹر رام چندانی کی دوسری منزل پر لفٹ سے باہر آیا تو یاسمین کارڈیک سرجن کے ساتھ ایک اور کارڈیک سرجن میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی تلاش اچھی نہیں تھی اور اس نے وضاحت کی کہ روبوٹک سرجری کامیاب ہونے کے باوجود اب بائی پاس آرٹری میں سے ایک سب سیکشن آرٹری پر زیادہ دباؤ ڈال رہی ہے اور انہیں اگلی صبح اوپن ہارٹ کرنا پڑے گا۔

یاسمین ابھی بھی اینستھیزیا کے زیر اثر تھی، ایک رہائشی معالج کے سمجھانے کے بعد اس نے رضامندی پر دستخط کر دیے۔ شرمین اور توصیف ہمیشہ میری ضرورت کے وقت میری مدد کرنے کے لیے موجود رہتے تھے۔ خاندان کے دیگر افراد نے

نامعلوم وجوہات کی بنا پر دور رہنے کا انتخاب کیا۔ آخر کار، اس کی اوپن ہارٹ سرجری اچھی طرح سے ہوئی اور سرجن نے بہتر تشخیص فراہم کی۔ آنے والے دن، بلاشبہ ہمارے لیے چیلنجنگ تھے اور میں نے اس کے ساتھ رہنے اور اس کی مدد کرنے کی پوری کوشش کی کیونکہ ہم ہسپتال میں 5 دن کے بعد گھر آئے تھے۔ اس کی ایک بہن حوا ما کے پاسپورٹ پر امریکی ویزا ۔تھا اور میں نے اسے ایئر لائن کا ٹکٹ بھیج دیا تاکہ وہ بھی آکر ہماری مدد کر سکیں

دو دن کے اندر وہ یہاں آ گئی۔ اس دوران میں اور یاسمین نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس کی بہن یہاں موجود ہے میں کام پر جاؤں گا اور جب وہ واپس جائے گی تو میں مزید دو ہفتے لے سکتا ہوں۔ یاسمین، زندگی میں کئی سرجریوں کے بعد، لڑنے کے لیے مزید ہمت پیدا کر چکی ہے، پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ وہ فطرت کے مزید امتحانات سے نمٹنے کے لیے بہت تھک چکی ہے۔ صحت یابی، ٹھیک ہو گئی اور اب کئی سال ہو چکے ہیں اور اس نے میرے ساتھ اپنی چہل قدمی جاری رکھی ۔اور بہت بہتر محسوس کر رہی تھی

:2015 تابش کی پیدائش: 21 نومبر

شرمین اور توصیف مئی 2015 کے آخر میں بہت پرجوش تھے جب انہوں نے جنوری 2016 میں نئے آنے والے کا اعلان کیا۔ اس نے خود کو اپنے کام میں بہت زیادہ مصروف رکھا اور اپنے نئے بچے کی تیاری شروع کر دی۔ اکتوبر کے آخر ۔میں، اسے بتایا گیا کہ وہاں کچھ حمل کے ساتھ مسائل تھےاور گائناکالوجسٹ نے اسے خبردار کیا

تابش ابان، ایک لڑکا، 21 نومبر2015 کو پہنچا تھا۔ ایک چھوٹا بچہ، لیکن ایک بڑا لڑاکا اور بہت بڑے جگر والا تھا۔ پانچ جنوری ۔2016 جس دن وہ گھر آیا اتفاق سے وہ دن میری اپنی سالگرہ تھی۔اپنے نئے نواسے کے ساتھ ہم سب بہت خوش تھے

آخر 2015 میں، میں نے اپنے باس کو مطلع کیا کہ میں غالباً دسمبر 2016 میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ ہم نے پہلے ہی 2014 میں سعودی اور پاکستان کا سفر مکمل کر لیا تھا، اور ہم نے نومبر 2016 میں عمرہ کے سفر کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ تعطیلات استعمال کرنا چاہتا تھا کیونکہ ہیرس نے آپ کی چھٹیوں کی تنخواہ کا صرف 50٪ ادا کرتی جب آپ چھڑ کر چلے جائیں یا ریٹائر ہوجائیں۔ میں نے اپنی ماں سے پہلے ہی وعدہ کیا تھا کہ دسمبر 2016 میں ریٹائر ۔ہوتے ہی میں کراچی میں ان سے ملنے جاؤں گا

ہم نے نومبر 2016 میں اپنے سعودی عرب کے دورے کا لطف اٹھایا، اس دوران میں کنگ فیصل ہسپتال اور ریسرچ سینٹر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنے میں کامیاب رہا۔ 1998 میں جب میں وہاں سے چلا گیا تو ہسپتال اب بہت مختلف تھا۔ بہت سی نئی عمارتوں کے ساتھ ساتھ نئے طبی شعبے بھی شامل یا توسیع کر دیے گئے تھے، تاکہ ریسرچ سنٹر اب میرے دورے میں اس سے چار گنا زیادہ ہو گیا۔ حماد الدیگ، میرے سابق باس اور میرے پسندیدہ ملازم عامر الراشد کے ساتھ میری ملاقات بہت اچھی رہی۔ حماد اور عامر دونوں نوجوان ریٹائر ہوئے۔ مملکت میں، جب سعودی حکومتی اداروں کے ساتھ اپنے 20 سال مکمل کرتے ہیں، تو وہ مکمل ریٹائرمنٹ کے حقدار ہوتے ہیں۔

دو ہفتے یقینی طور پر کافی نہیں تھے۔ اب ہم ہیوسٹن واپس آ چکے تھے۔ میراباس، ڈیوڈ لیمین، اور میرے ساتھی ریٹائرمنٹ پارٹی کی تیاری کر رہے تھے۔

ڈیوڈ نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے خاندان کو بھی شامل کروں۔ تاریخ کا فیصلہ 8 دسمبر 2016 کو جمعرات کی سہ پہر کو کیا گیا تھا، تاکہ ہر کوئی شرکت کر سکے۔ پارٹی کے دن، ہم انتظامی دفاتر کے کیفے ٹیریا پہنچے جو ہمارے اعزاز میں خصوصی طور پر بک کیا گیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے حارث کے اتنے ساتھیوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ ہمارے اعزاز میں تقاریر اور عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میں اپنے تمام ساتھیوں کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے پوری فیملی کے لیے حلال کھانے کا انتظام کرنے میں بڑی مشقت کی۔

میں نے پہلے ہی سی آئی او، ٹم ٹنڈل، اپنے باس، ڈیوڈ لیمین، ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر آف انسلری سسٹمز، اور اپنے تمام عملے کو تحائف پیش کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ سب اسے پسند کرتے تھے۔

میں 26 جنوری، 2017 کو خودکار بل کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اور پڑوس کی پولیس کے ساتھ اپنے گھر کی سیکیورٹی کے انتظامات کے بعد پاکستان کے لیے روانہ ہوا جب ہم دور تھے۔

ہمیشہ کی طرح کراچی کا موسم بہت اچھا تھا اور ہم نے اپنے سفر کا لطف اٹھایا۔ ہمارا بنیادی مقصد میری ماں سے ملنا اور اپنے گھر کو ٹھیک کرنا تھا، جس کی 27 سال بعد کچھ دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ میرے بہنوئی اقبال موتی نے میری تزئین و آرائش میں مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا جب وہ پہلے ہیوسٹن میں ہم سے ملنے آئے تھے۔ اگلے آٹھ ہفتوں تک ہم دیکھ

بھال کے عملے کی مدد کرنے اور اپنی ماں سے ملنے میں مصروف رہے۔ جب بھی میری امی مجھے اپنے کمرے میں آتے ہوئے دیکھتیں تو وہ ہمیشہ ایک ہی دو باتیں کہتی، #1) میری آنکھیں تمہاری آمد کے لیے دروازے کو دیکھ رہی ہیں اور #2) کیا تم نے آج کھانا کھایا، تم اتنی پتلے لگ رہے ہو؟ اے اللہ، ہم سب بھائیوں اور بہنوں کے لیے اتنی محبت کا مظاہرہ کرنے کے لیے میں اسے ہمیشہ یاد کروں گا۔

آٹھ ہفتوں کے دوران جب میں کراچی میں تھا، میں نے پہلی بار اپنی بہن یاسمین کو بتایا کہ جب میں ریٹائرڈ ہوں اور میرے لیے اسے 6000 ڈالر سالانہ، تقریباً 500 ڈالر ماہانہ بھیجنا جاری رکھنا بہت مشکل ہوگا۔ میں نے اسے 2017 کے اخراجات کے لیے 5000 ڈالر دیے اور اپنی دونوں بہنوں یاسمین اور محمودہ سے کہا کہ وہ احتیاط سے بجٹ بنائیں۔ میں اس وقت نہیں جان سکتا تھا کہ ہماری ماں اس سال میں چار مہینے میں ہی گزر جائے گی۔ پہلے محمود بھائی کے ساتھ تدفین کے اخراجات کے بارے میں بات کرنے کے بعد، ہم نے تدفین اور دیگر اخراجات میں سے 250,000 روپے کی لاگت کو پورا کرنے کے لیے کافی رقم مختص کی تھی۔

ان دو ماہ کے لیے ماں سے ملنا ایک نعمت تھا۔ جیسا کہ وہ ہر سال کرتی تھی، اس نے درخواست کی کہ میں اس بات کو یقینی بناؤں کہ خاندان کے ہر بچے کو آنے والی عید کی ادائیگی کی جائے۔ ہماری بہن یاسمین انہی فنڈز سے ادائیگی کرنے پر راضی ہوگئیں۔ ایک بات اس نے مجھ سے اور یاسمین کو بتائی، اور یہ میں کبھی نہیں بھولوں گا، اسے امید تھی کہ نعمان بہتر ہو جائے گا اور شادی کر لے گا اور مجھے ایک بار پھر اس پر فخر ہو گا۔

وہ ایک انتہائی بہادر خاتون تھیں، ہم سب کی دیکھ بھال کرتی تھیں، دن میں تین وقت کا کھانا فراہم کرتی تھیں، اکثر ہمیں کھانا کھلانے کے لیے اپنا کھانا چھوڑ دیتی تھیں۔ جب آپ کے 10 بچے ہوں تو یہ بہت ممکن ہے کہ کچھ کو نظر انداز کیا جائے۔ اس پر وہ پریشان ہوئی اور مجھ سے درخواست کی کہ براہ کرم ہم سب سے درخواست کریں کہ وہ اسے معاف کر دیں اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ اس نے مجھے اپنے بچوں میں سے ہر ایک کو بتانے کو بھی کہا کہ وہ ان میں سے ہر ایک سے بہت پیار کرتی ہے اور اس نے کبھی بھی ان میں سے کسی کے ساتھ جان بوجھ کر امتیازی سلوک نہیں کیا۔ اس نے مجھ سے ذاتی طور پر منور کے لیے معافی مانگی۔

میں نے انسانی طور پر اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کی۔ میں اور یاسمین دونوں اسے بتائے بغیر کراچی پہنچ گئے (صرف ہماری بہن یاسمین جانتی تھی) اور سیدھے شادی ہال میں چلے گئے جہاں ابراہیم (محمودہ کے بیٹے اور میرے بھتیجے) کی شادی کا ولیمہ تھا۔ ماں، باقی سب کے ساتھ، ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ بدقسمتی سے، 2-3 دن بعد ۔رات کے وسط میں، ماں گر گئی

اور اس کے بائیں گھٹنے کو زخمی کر دیا۔ وہ کئی سال پہلے اپنی دائیں ٹانگ میں چوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ جیسا کہ اقبال موتی کی والدہ کو بھی اسی قسم کی چوٹ لگی تھی، اس لیے ہم نے ان کی والدہ کے معالج سے اپنی ماں کے لیے مدد کی درخواست کی۔ ہم نے گھر پر ایک پورٹیبل ایکسرے کیا، بلیو کراس ایکسرے اور لیب سے آنے والے تکنیکی ماہرین۔ ایکسرے رپورٹس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی چوٹ آخری سرجری سے پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی اور بائیں فیمر گھٹنے کے قریب کچلا گیا تھا۔ کنسلٹنگ سرجن کسی بھی سرجری کی سفارش نہیں کرے گا، کیونکہ اس کا آسٹیوپوروسس انتہائی ترقی یافتہ تھا لیکن اس کے لیبارٹری کے نتائج بہت نارمل تھے۔ کچھ دنوں بعد، جب میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور ماں اور بہنوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، بائی اپنی بیٹیوں عظمیٰ اور حنا کے ساتھ آئی۔ میں حنا کو نہیں پہچانتا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لیاقت ہسپتال کی ریزیڈنٹ فزیشن ہے۔ یہ جاننے کے بعد، میں نے اس سے دوسری رائے حاصل کرنے کے لیے ماں کے ایکس رے کو دیکھنے کو کہا۔ اس نے سرجری کے خلاف بھی مشورہ دیا۔ اس دن سے، حنا اکثر ماں سے ملنے جاتی تھی اور اس کے دائیں پاؤں سے خشک گینگرین نکالنے کے لیے ایک سرجن کو ان کے ساتھ ملنے کا انتظام بھی کرتی تھی، جب کہ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے ماں کا دایاں ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ میں ڈاکٹر حنا کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے ہماری ۔والدہ کے علاج پر بھرپور توجہ دی جب میں وہاں تھا

ایک دن الیاس احمد جو کہ ہماری بی ایم بی کے کلاس میں سے ایک دوست تھا۔ ایک دن فجر کی نماز کے بعد دونوں کراچی ۔کے کئ مقامات کی سیر کے لئے نکل گئے ۔ ہمارا راستہ ایمپریس مارکٹ کے قریب ہمارا پرانا بی ایم بی اسکول تھا

فریر روڈ، جے ایم اے سکول، جمیل میمن کا گھر، رتن تالاب (اشرف مجید کا گھر) میری نانی کا گھر، اردوبازار اور ویمن کالج ۔کے قریب سے گزرے

۔ سلیم چھاپرا کا گھر جہاں ہم حاجرہ بائی منزل کے قریب کھیلتے تھے، برنس روڈ اور فاروق حبیب اور الیاس کا گھر

پھر ہم سعید منزل کے لیے روانہ ہوئے جوبلی سینما اور رنچھور لائنز کی طرف۔ یہ ایک خوبصورت صبح تھی ۔ ہم دونوں اس وقت ساٹھ کی دہائی میں تھے اور کراچی بہت بدل چکا تھا۔ ہم دونوں جوبلی سنیما کے قریب رک گئے۔ اور وہاں کی کئی تصویریں بنائیں۔ ہمارا اگلا پڑاؤ مشہور ہوتھی مارکٹ تھا۔الیاس نے اپنی گاڑی قریب کھڑی کی اور ہوتی مارکٹ میں داخل ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے شہر کے حکام بھی نہیں ہیں۔ ایسے مشہور مقامات کو برقرار رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ کونے پر، حجام کی دکان اب بھی وہیں تھی جہاں میرے والد ہمیں بال کٹوانے کے لیے لے جاتے تھے۔ اس وقت حجام کی دکان میں صرف چھت کے پنکھے تھے اور اب اس میں کچھ ایئر کنڈیشننگ ہے۔ یہیں سے وہ گلی شروع ہوئی جہاں ہم اپنے زیادہ تر بچپن میں رہتے تھے - غزدر آباد۔ جب ہم اس عمارت کے قریب پہنچے جہاں ہم آخری بار رہتے تھے، میرا احساس بہت مختلف تھا۔ میں ماضی میں تھا، عمارت کے دروازے پر چھلانگ لگا کر اتنی تیزی سے اوپر جانے لگا جیسے میں بچپن میں جاتا تھا۔ الیاس بالکل میرے پیچھے تھا۔ چند منٹوں کے لیے، میں نے اپنے تمام نو بھائیوں اور بہنوں کو چیختے اور کھیلتے ہوئے سنا۔ مین دروازہ بند تھا اور میں اس پر دستک دینے کے لیے جلدی سے پہنچا۔ روٹی یا کھانا پکانے کی کوئی بو نہیں تھی جسے آپ لفظی طور پر سونگھ سکیں اور بتا سکیں کہ اس دن کیا پکایا گیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور افسوس کہ میرا استقبال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اچانک مجھے اپنے خواب سے باہر آنا پڑا، جب الیاس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ کچھ تصویریں کھینچ سکتا ہے؟ میں نے اپنی یادوں کو یاد رکھنے کے لیے اپنی ایک سیلفی بنائی۔ اپنے ماضی کو کبھی نہ بھولیں بلکہ اس سے سبق سیکھیں۔ ۔خواب دیکھنا کچھ بھی ناممکن نہیں، یہ آپ کی مسلسل محنت اور زندگی کے لیے لگن ہے، آپ کو وہاں تک پہنچائے گا

ہم 21 مارچ کو ہیوسٹن واپس آئے اور اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ یکم مئی 2017 کو، چند ہفتوں کے بعد، مجھے صبح سویرے میرے بہنوئی اقبال موتی کا فون آیا کہ وہ مجھے میری والدہ کی وفات پر تسلی دے رہے ہیں۔ ہم دونوں کو جلد ہی احساس ہو ۔گیا کہ مجھے اپنی ماں کے انتقال کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ میں نے فوراً محمودہ کو فون کیا جس نے تصدیق کی

اس صبح ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ محمودہ نے بتایا امی کا جنازہ تیار تھا۔ نماز جنازہ کے لیے مسجد لے جایا جائے گا۔ میں نے اپنی بہن یاسمین کو بھی بلایا جو محمودہ کی جگہ پر موجود تھی۔ میں نے تمام بھائیوں اور بہنوں کو بروقت اطلاع دی لیکن ان ۔سب کو علم ہوچکا تھا

اس انتقال سے ایک رات پہلے، میں ان کے ساتھ ایک ویڈیو کانفرنس کی تھی اور اس وقت روف ماما کے ساتھ سب بہنیں وہاں موجود تھیں، اور امی کو شام کے کھانے کے لیے کیلے کا شیک دیا گیا۔ وہ تمام کلمات پڑھ چکی تھیں اور سونے سے پہلے ان کے کان میں یاسین کا ورد کر چکی تھیں۔

اس کی نگہبان سعیدہ جو کہ ایک شاندار خاتون تھیں، 24 گھنٹے اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ماں اس رات 3 بجے کے قریب جاگ کر پانی مانگنے لگی اور پھر پانی پی کر سو گئی۔ صبح 9 بجے کے قریب جب سعیدہ نے ماں کا ناشتہ تیار کر کے اسے جگانے کی کوشش کی تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر کو گھر بلایا۔

ڈاکٹر نے 1 مئی 2017 کو صبح 9:30 بجے کے قریب فیصلہ سناتے ہوئے سب کو مطلع کیا کہ ماں کی موت تین سے چار گھنٹے پہلے ہوئی ہوگی۔ اس سے ان کی موت کا وقت صبح 6 سے 6:30 بجے تک، فجر کی نماز کے وقت ہوتا۔

اگلے دن، نعمان، بیماری اور کام سے باہر ہو کر ہمارے گھر چلا آیا۔ وہ جلد ہی ایک بار پھر خوشگوار زندگی گزار رہا تھا، اور ہم وہ مدد فراہم کر رہے تھے جس کا وہ حقدار تھا۔ ہم نے مشاہدہ کیا کہ اس کا وزن کم ہو گیا ہے، اس لیے میں نے اسے مناسب جانچ کے لیے اس کے پی سی پی کے پاس لے جانا شروع کیا۔ ہمیں پتہ چلا، وہ شدید ذیابیطس کا شکار تھا اور اپنا خیال نہیں رکھتا تھا۔ پی سی پی نے ایک جی آئی ماہر کے پاس جانے کی سفارش کی جہاں وہ پیٹ کے ایم آر آئی سمیت کئی ٹیسٹوں سے گزرے۔ نتائج تباہ کن تھے۔ اس کا لبلبہ کافی انسولین نہیں بنا رہا تھا اور وہ اپنی شوگر کو جلانے کے لیے اتنی انسولین نہیں لے رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں لبلبے کی سوزش ہوئی جہاں وہ اپنے پیٹ میں شدید درد میں تھا۔ مہینوں بعد، جی آئی نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے لبلبے میں سٹینٹ ڈال سکتا ہے۔ یہ طریقہ کار ستمبر میں آؤٹ پیشنٹ سیٹنگ میں ترتیب دیا گیا تھا۔ جی آئی ایک جگہ پر اسٹینٹ کرنے کے قابل تھا جب کہ وہ لبلبے کے بڑے حصے کو اسٹینٹ کرنے سے قاصر تھا کیونکہ اس کی نالیوں کو مکمل طور پر بند کردیا گیا تھا۔

ہمارے ساتھ چھ ماہ رہنے کے بعد، ہمارا بیٹا نعمان صرف 34 سال کی عمر میں 24 اکتوبر 2017 کو اپنی نیند میں انتقال کر گیا، جب میں جی آئی سے بات کر رہا تھا، تو وہ بتا رہے تھے کہ درد بہت شدید تھا، پھر بھی اس نے کبھی شکایت نہیں کی اور ہر دن یہ سوچ کے لیا کہ اگلا دن اس کے لیے بہتر ہوگا۔ اس نے یقینی طور پر یہی سوچ کر اور وہ اللہ کے پاس واپس چلا گیا، یہ ایک بہت بہتر جگہ ہے جہاں اسے دنیاوی معاملات کی فکر نہیں کرنی پڑتی۔ اب جب کہ وہ ہمیشہ کے

لیے چلا گیا ہے، ہم زندگی بھر اس کی کمی محسوس کریں گے اور اپنے دلوں سے غم کبھی نہیں مٹا سکیں گے۔ اللہ ان کے تمام گناہ معاف فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

وہ متجسس، زندہ دل اور ذہین تھا۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ مہربان اورپیار کرنے والا تھا جس نے گفتگو کو روشن کیا، ایک کمرے کو روشن کیا، اور دل کو گرمایا۔ وہ کتابوں سے محبت کرتا تھا، خاص طور پر روحانیت، جامع زندگی کے بارے میں کتابیں۔

نعمان کو جانوروں خصوصاً اپنے دو کتوں سے عقیدت تھی اور وہ ان کی تربیت اور ان کی دیکھ بھال میں وقت گزارتے تھے۔

یہ نعمان کی کہانی ہے اور میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ اسے اپنے پیاروں کے ساتھ شئیر کریں۔

وہ خوبصورت، ذہین، تعلیم یافتہ اور اچھی بات کرنے والا۔ اسے ہر وہ موقع دیا گیا جو ایک بچے کو ہونا چاہیے تھا۔ ہم محنتی والدین ہیں جن کے پاس ہے۔ اپنے بچوں کو اخلاق اور اقدار کے ساتھ پرورش کیا۔ ہم عام لوگ ہیں جن کے پاس ہے ہمیشہ اپنے بچوں کو بہترین دیا. نعمان نے 16 سال کی عمر سے کام کیا اور اپنی موت سے پہلے آخری دن تک خود کو سہارا دیا۔ وہ ہمیں بہت محبوب تھا۔ اگر نعمان کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے عمرے کا آغاز صرف 2 سال کی عمر میں کیا۔ ہم نے رمضان کا زیادہ تر حصہ اپنے والدین کے ساتھ کراچی میں گزارا۔

ہم نے مختلف ممالک کے 40 دورے کیے اور جب بھی ہم مختلف جگہوں پر گئے تو وہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس نے بہت سی ویڈیوز اور تصاویر لیں۔

ایک بار پھر، یہاں میرے آخری الفاظ یہ ہیں کہ براہ کرم کھلے ذہن کو رکھیں۔ ہم فرشتے نہیں ہیں اور ہم غلطیاں کرتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کے سامنے اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے اور توبہ کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں انہیں اجر ملے گا۔ یہاں میرا مقصد اپنے تجربات کو سچائی کے ساتھ بیان کرنا اور دوسروں کو اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کی ترغیب دینا تھا۔ مجھے پوری امید اور دعا ہے کہ قارئین میرے تجربات سے سیکھیں گے۔ میں اپنی بیوی کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور صحیح معنوں میں میری رہنمائی کی۔

# CHAPTER 9

## STORY OF MY DAD MOHAMMAD A. KARIM MOTON IN HIS OWN WORDS

میرے والد محمد اے کریم موٹن کی کہانی ان کے اپنے الفاظ میں

میرے والد محمد عبدالکریم موتن کا انٹرویو یحییٰ ہاشم باوانی نے لیا، جو میمن مصنفین میں سے ایک اور والد صاحب کے اچھے دوست تھے۔ کئی سال بعد، مئی 1998 میں والد صاحب کی وفات کے بعد، انہوں نے مجھے انٹرویو کی ایک کاپی ایک کیسٹ پر دی۔ والد صاحب کی میری تمام یادیں واپس آگئیں، اور میں نے مناسب سمجھا کہ انٹرویو کا استعمال کرتے ہوئے ایک باب ان کے لیے وقف کر دوں، ان کہانیوں کے ساتھ جو انھوں نے مجھ سے شیئر کی تھیں۔ میں اپنے والد کی زندگی کی کہانی اس طرح دوبارہ تخلیق کروں گا جیسے وہ اپنی سوانح حیات لکھ رہے ہوں، جیسا کہ میں نے کیا ہے۔

میں 8 فروری 1928 کو جیت پور، انڈیا میں عبدالکریم موتن اور عائشہ باوانی کے ہاں پیدا ہوا۔ میرے بہن بھائیوں میں غلام احمد جان، رابعہ اور عثمان شامل ہیں، جو سب مجھ سے پہلے پیدا ہوئے،

اور حلیمہ، سب سے چھوٹی۔ حلیمہ کے بعد ایک بیٹا عمر پیدا ہوا جو بچپن میں ہی فوت ہو گیا۔ اس وقت میرے بڑے بھائی غلام احمد جان نہ سن سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے۔

ایک بیماری کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کے پہلے سال میں ہی سننے اور بولنے کی قوت کھو چکے تھے۔ عائشہ باوانی، میری ماں، میرے والد کی تیسری بیوی تھیں۔ ان کے دو بچے موسیٰ اور حنیفہ تھے۔

پہلی بیوی، جس سے ان کی طلاق ہوئی تھی۔ ان کی دوسری بیوی بچے کی پیدائش کے دوران فوت ہو گئی۔

رابعہ (ہم اسے بائی کہتے تھے)، میری بڑی بہن، شادی شدہ تھی اور رنگون میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میری یاد 1940 کی ہے، جب بائی 1940 میں جیت پور آئے تھے۔ اس وقت میری عمر 12 سال تھی۔ میں پہلے ہی اپنی ماں کو یاد کر رہا تھا، جسے میں نے پچھلے سال کھو دیا تھا۔ میری ماں کو ٹی بی ہو گئی تھی اور ان کے دائیں ہاتھ پر شدید خارش تھی جسے میں ہر روز شام کو صاف کرنے میں مدد کرتا تھا۔ ایک دن، جب میں اس کے زخم کو صاف کرنے میں اس کی مدد کر رہا تھا، اس نے کھانستے ہوئے مجھ سے کچھ پانی لانے کو کہا۔ میں پانی کا گلاس ہاتھ میں لے کر واپس آیا تو وہ گر چکی تھی۔ میری چیخیں سن کر میرے والد بھاگے آئے۔ اس نے اس کی نبض چیک کی اور کہا کہ ہم اسے کھو چکے ہیں۔

بائی کو میری پڑھائی کی فکر تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس جماعت میں ہوں اور میں نے جواب دیا کہ پہلی جماعت۔ یہ سن کر وہ قدرے پریشان ہوئی اور مجھے بتایا کہ میں اپنی پڑھائی میں واقعی پیچھے رہ گیا ہوں۔ اس نے میرے والد سے کہا کہ وہ مجھے ہندوستان کے راجکوٹ میں بورڈنگ اسکول بھیجیں۔ مجھے راجکوٹ کے شورستر پرائمری اور ہائی اسکول میں پہلی جماعت کی انگریزی میں داخل کرایا گیا، اور میں راجکوٹ کے بورڈنگ اسکول میں رہنے چلا گیا۔ میں ایک بہت اچھا طالب علم تھا اور پہلی بار کلاس میں اول آیا تھا۔ اسماعیل گل اس وقت ہمارے جسمانی صحت کے استاد تھے اور فیض محمد ہمارے ڈرل ماسٹر تھے۔ اسماعیل گل نے جب مجھے باڈی بلڈنگ ایکسرسائز کرتے دیکھا تو اس نے مجھے ڈائننگ روم کا مانیٹر بنادیا۔ ظاہر ہے، میں اور میرے دوست اس فیصلے سے بہت خوش تھے کیونکہ تب سے ہم سب کو اچھی طرح سے کھانا کھلایا گیا تھا۔

بدقسمتی سے، میں مانیٹر بننے کے بعد، میں اپنی پڑھائی میں سنجیدہ نہیں تھا۔ ہمارے سپرنٹنڈنٹ بہت پریشان تھے کہ میں اپنے اسکول کو یاد کر رہا ہوں۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ میں بہت زیادہ بات کر رہا ہوں۔ اور 1944 کے آخر میں یا 1945 کے اوائل میں مجھے واپس جیت پور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جیت پور میں، جیسا کہ کرنے کو کچھ نہیں تھا، وہاں میرا وقت ضائع ہوا۔ محلے کی ایک عورت ہمارے لیے روٹیاں بناتی تھی اور میرے والد بکرے کا گوشت پکاتے تھے۔ یہ ہمارے دو کھانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

جیسے ہی آپ ہمارے گھر کے گیٹ سے داخل ہوں تو آپ دیکھتے کہ یہ اصل میں رہنے کے قابل تین مکانات اور ایک بہت بڑا صحن پر مشتمل تھا۔ میرے دادا بہت امیر تھے اور انہوں نے اپنے ہر ایک بیٹے، بڑے عبدالکریم، درمیانے بیٹے نور

محمد اور سب سے چھوٹے شکور کے لیے ایک گھر بنایا تھا۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا اور اس میں 18 سے 20 کمرے تھے۔ کیونکہ باقی سب باہر چلے گئے تھے، اس بڑے گھر میں صرف میرے والد، میرے بڑے بھائی غلام، میری بہن حلیمہ اور میں تھے۔ میرے بھائی عثمان کی شادی کے بعد وہ گھر چھوڑ کر ڈھاکہ چلے گئے تھے۔ میں ایک دن زخمی ہو گیا تھا جب ایک عمارت مجھے جزوی طور پر گر گئی۔ میرے سر کی چوٹ پر کئی ٹانکے لگے لیکن میں بچ گیا۔ اس حادثے کے ساتھ ساتھ جیت پور کی تنہائی اور میری ماں کی گمشدگی نے ڈپریشن اور اضطراب کو جنم دیا۔ میرے والد نے مجھے ان لوگوں پر تسلی دینے کی کوشش کی جب انہوں نے رات کے وقت میرے رونے سے میرا تکیہ گیلا پایا۔ میرے خیال میں وہ خود شدید ذہنی دباؤ میں تھے، اور میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ میرے، میری بہن حلیمہ اور میرے بہرے بھائی غلام کے بارے میں فکر مند تھے۔

میری بہن حلیمہ، جو ٹی بی سے بیمار ہو گئی تھیں، مجھے بھی وہی مسائل درپیش تھے۔ کئی بار، میرے والد اور مجھے اسے صاف کرنا پڑا، کیونکہ وہ اپنی آنتوں کی حرکت کو منظم کرنے سے قاصر تھی۔ اور، صرف سولہ سال کی عمر میں، وہ انتقال کر گئی۔ میری افسردگی کی وجہ سے، مجھے ایک مزار پر لے جایا گیا - مینا داتار کی قبر، جہاں مزار کے ملا نے مجھے زنجیروں میں جکڑ کر علاج کیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے بڑے بھائی نے مجھے مزار پر بھیجے جانے پر اعتراض کیا تھا کہ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ واضح طور پر پریشان، وہ میرے والد سے لڑنے لگے۔ اس دوران میرے والد صاحب کو دل کا شدید دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہوگیا۔

مزار کے ملا کے چند ماہ تک میرا علاج کرنے کے بعد میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں ممبئی کے لیے روانہ ہوا اور ایک سیکورٹی گارڈ کے طور پر 100 روپے دے کر نوکری حاصل کی، اناج کے تھیلوں کو ٹرک پر لدے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں گودام کے ساتھ والے کمرے میں سوتا تھا۔ ایک دن میرے باس نے ٹرک کی لوڈنگ کے دوران مجھے سوتے ہوئے پایا اور مجھے نوکری سے برخاست کر دیا۔

پھر میں اپنی بہن کے ساتھ رہنے کے لیے رنگون چلا گیا۔ ایک بار پھر میں نے ذہنی مسائل کا تجربہ کیا جن کی میرے پاس صرف مبہم یادیں ہیں۔ میں ایک دن ایک ہسپتال میں بیدار ہوا جہاں ایک برطانوی ڈاکٹر، ڈاکٹر چیری، میرے غیر معمولی رویے کی وجہ سے میرا علاج کر رہا تھا۔ وہ مجھے روزآنہ بجلی کے جھٹکے دیتا تھا۔ ظاہر ہے، میں اس سے ٹھیک ہونے لگا۔

بجلی کے جھٹکے، جو اگرچہ انتہائی تکلیف دہ تھے، آخر کار مجھے اپنے ہوش میں لے آئے۔ یہ میرے بہنوئی عبدالستار سلیمان موتن تھے جنہوں نے رنگون کے ایک بہترین ہسپتال میں میرا علاج کروایا تھا۔رنگون میں زندگی بہت بہتر تھی کیونکہ میں رشتہ داروں کی صحبت میں تھا۔ میری بہن نے بہت شفقت سے میرا خیال رکھا۔ میرے بہنوئی مجھے رنگون سے تقریباً 100 کلومیٹر دور ممبو میں اپنے کام پر لے جانے لگے۔ اس کا خاندان جس کے پاس تیل کے بہت سے کنویں تھے، بہت امیر تھا۔ بعد میں، مجھے ان کی کچھ جائیدادوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کی ذمہ داری دی گئی۔ بہت سے برمی کارکنان، مرد اور خواتین، خاندانی ادارے کے مختلف پہلوؤں کے ذمہ دار تھے۔ ایک دفعہ میرے بہنوئی مجھے احمد آباد سورت میں اپنی ماچس کی فیکٹری لے گئے۔ واپسی پر میں بہت بیمار ہو گیا اور کچھ دیر گھر میں رہنا پڑا۔

آئل فیلڈ میں کام کے دوران مجھے ایک برمی لڑکی سے پیار ہو گیا تھا۔ اس کے والدین کو یہ خیال پسند نہیں آیا اور انہوں نے میری بھابھی سے شکایت درج کرائی۔ میں واقعی میں یہاں اپنے وقت سے لطف اندوز ہو رہا تھا، لیکن اس واقعے کے بعد، مجھے رنگون چھوڑنے کو کہا گیا۔ میں ممبئی آیا اور 1948 میں کراچی آنے کے لیے پرمٹ کے لیے درخواست دی، جہاں میں اپنے بھائی عثمان کے ساتھ رہنے لگا۔ اس نے مجھے شکارپوری بازار میں ایک چھوٹی سی جگہ لینے کو کہا۔ وہاں زندگی بہت مشکل تھی، لیکن مجھے یقین تھا کہ، طویل مدت، میرا مقصد ایک بروکر بننا ہے۔

ایک دن، میں علی چنگا موتن (میرے دور کے کزن میں سے ایک) کے پاس گیا جس نے مجھے اپنے ساتھ سکھر جانے کی دعوت دی، جہاں اس کے خاندان کا کاروبار تھا۔ ان کے ساتھ 13 سے 14 ماہ کام کرنے کے بعد میں کراچی واپس آگیا۔

میرا بھائی عثمان اور اس کا خاندان ڈھاکہ چلا گیا، جہاں اس نے آدم جی جوٹ ملز میں کام کرنا شروع کیا۔ میں اپنے کزن کے بھائی باقی موتن سے ملنے گیا۔ رات کے کھانے کے بعد اکثر میں ان کے پاس رات گزارتا۔ میری بھابھی مجھے دن بھر کے لیے گوشت اور سبزی خریدنے کے لیے 10 روپے دیتی تھیں۔ میں نے 10 روپے میں سے بچ جانے والی تبدیلی کو کبھی واپس نہیں کرتا، اس رقم کو اپنے اخراجات کے لیے رکھ لیتا۔ ایک دن میرے کزن نے کہا کہ وہ خوش ہے کہ میں اپنے اخراجات کے لیے کما رہا ہوں، لیکن کیا میں سمجھتا ہوں کہ گروسری خریدنا ایک کیریئر ہے۔ "آپ کو نوکری حاصل کرنی ہوگی اور کام شروع کرنا ہوگا،" انہوں نے کہا۔ اس لیے مجھے کپڑے کی ایک دکان پر 45 روپے ماہانہ پر نوکری مل گئی۔

ایک دن رمضان کے مہینے میں میں دوپہر کو گھر کے لیے نکلا اور عصر کی نماز تک کام پر واپس نہیں آیا۔ باس نے غصے میں آکر کہا کہ میرا رویہ ناقابل قبول ہے۔ میں اس کے مشورے کو قبول نہ کر سکا اور اپنے سات دنوں کے کام کی ادائیگی کے لیے لینے کے بعد گھر آ گیا۔ مجھے دلالی میں واقعی دلچسپی تھی، جیسا کہ میں جانتا تھا کہ کوئی پابندیاں نہیں ہیں اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ میں خود مختار ہو جاؤں گا۔ میرے کزن باقی نے مجھے اپنے ساتھی غلام ستار باوانی کے ساتھ کام شروع کرنے کو کہا۔ میں سامان کی ترسیل، معاہدوں اور ڈپازٹس کا ذمہ دار تھا۔ ہر اتوار کو، میں دلالی لینے اور اسے اپنے پاس لانے کا ذمہ دار تھا۔

کزن اور اس کے ساتھی. دلالی اکثر 1200 روپے یا اس سے زیادہ ہوتی تھی، اور وہ مجھے اپنے حصے کے کام کے 10 روپے دیتے تھے۔ اس انتظام سے ناخوش، اور میں نے اپنے لیے بروکریج میں موقع تلاش کرنا شروع کیا۔ میرے ایک دوست عثمان دادا (اسو) اسی کاروبار میں شامل ہونے میں دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے ہم نے مل کر شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اوسو کے بڑے بھائی حاجی قاسم نے سیٹھ ماما ولی سے کہا کہ وہ ہم دونوں کو چھٹی دے دیں تاکہ ہم اکیلے رہ سکیں۔ سیٹھ ماما ولی نے وہ پہلا وقفہ فراہم کیا اور ہم نے اپنے پہلے لین دین سے ایک اچھا بروکریج اٹھایا۔ سیٹھ ماما ولی مہربان تھے اور انہوں نے ہم دونوں کو مشورہ دیا کہ کسی بھی موقع پر یعقوب ٹریڈنگ کمپنی میں اسماعیل سیٹھ سے پوچھ لیں۔ اچانک ہمیں اسماعیل سیٹھ کے لیے مستقبل کی کچھ چیزیں بیچنے کے بہت سے مواقع ملے۔ ہر لین دین کے لیے ہمیں اچھی ادائیگی کی گئی۔ اس طرح بروکریج کے کاروبار میں ہمارے کیریئر کا آغاز ہوا۔

ایک دن، ہمیں 5000 گز کا ڈائمنڈ بروکیڈ 11 انا (16 انا ایک روپیہ) میں فروخت کرنے کے لیے دیا گیا۔ شام تک، ہمیں ایک پارٹی مل گئی جو 10.5 اناوں میں یہ مواد خریدنے کے لیے تیار تھی اور اس نے اسماعیل سیٹھ کو پیشکش کا مشورہ دیا۔ اسماعیل سیٹھ نے اتفاق کیا اور ہم سے فروخت کی تصدیق کرنے کو کہا۔ دفتر میں بیٹھے ایک اور بروکر نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ وہ 10.75 پر خریدنے کے لیے تیار تھا۔ تاہم سیٹھ نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور ہمیں یہ موقع دیا۔ ہم اسماعیل سیٹھ کے بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنا کاروبار شروع کرنے میں اتنی مدد فراہم کی۔ ہمارے لین دین سے اگلی ادائیگی 2800 روپے تھی جس میں میرا حصہ 1400 روپے تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنا پیسہ کما رہا ہوں۔ میں اپنی ممانی (مامی مومن) کے پاس گیا جو احمد حاجی ابداللہ باوانی کی اہلیہ تھیں۔ اس نے پوچھا کہ میں

کیسا ہوں؟ جب میں نے اسے اپنے لیے بچانے کے لیے 1400 روپے دیے تو وہ بہت خوش ہوئی اور وعدہ کیا کہ اگر میں مزید پیسے لاؤں تو وہ میری شادی کروا سکتی ہے۔ میں نے اگلے تین ماہ کی اپنی زیادہ تر کمائی اسے دے دی۔ اس نے حبیب ٹبا کی بیٹی کے لیے میری تجویز بھیجی، جو اس وقت بہت امیر شخص تھے۔ انہوں نے مجھے غنی کھٹارا (موتن) کے گھر انٹرویو کے لیے بلایا۔ تاہم انہوں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا کیونکہ انٹرویو کے بعد انہیں میرے ماضی کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔ اسی دوران غنی کھٹارا نے میری مامی سے کہا کہ تار محمد حاجی احمد میانور کی بیٹی کے لیے پرپوزل بھیج دیں۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ غنی کھٹارا کے بیٹے مجید کی منگنی تار محمد کی بیٹی مومن سے ہوئی تھی۔ کسی طرح منگنی ٹوٹ گئی لیکن غنی کھٹارا نے گھر والوں کو خوب جانتے ہوئے میری تجویز کی۔ دوسرا شخص جس نے میری تجویز کو قبول کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ نور بائی چنگی (علی چنگا موتن کی والدہ) تھیں۔ وہ بہت پریشان تھیں کہ حبیب ٹبا کے گھر والوں نے ان کی بیٹی کے لیے میری تجویز کو مسترد کر دیا۔ وہ اس وقت متاثر ہوئی جب میں سکھر میں ان کے کاروبار کے لیے کام کر رہا تھا اور جانتی تھی کہ ایک ایماندار آدمی ہوں۔ وہ میری مامی کے ساتھ اپنی بیٹی مومن کے لیے میرا تجویز تار محمد میانور خاندان کے پاس لے گئیں۔ وہ شروع میں خوش نہیں تھے کیونکہ انہیں پتہ چلا کہ میرے والد کو جیت پور میں کچھ مسائل تھے۔ ایک دن جب میں بازار میں اپنے کام میں مصروف تھا تو غلام چنگا نے مجھے روکا اور بتایا کہ تار محمد میانور میرا انٹرویو کرنے آئے ہیں۔ تار محمد بھائی مجھے چائے کی دکان پر لے گئے، جہاں ہم دونوں بیٹھ کر گپ شپ کر رہے تھے۔

انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں بروکریج میں کتنا کما رہا ہوں، اور میں نے اسے بتایا کہ میں ماہانہ 200 سے 300 روپے کما رہا ہوں۔ پوری ایمانداری سے، پچھلے مہینے میں، میں بہت خوش قسمت تھا اور تقریباً 2800 روپے کما چکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سوال کسی اور سے پوچھا جاتا تو وہ زیادہ نمبر دیتے، لیکن میں نے اس کے سوال کا جواب دیانتداری سے دیا۔ کسی طرح، میں جانتا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے. اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میرے دادا اور اس کی ماں بھائی اور بہن تھے، جس کا مطلب میرے والد اور وہ فرسٹ کزن (ماما اور پھوئی کے بہن بھائی) تھے۔

ایک دن جب میں دوبارہ اپنی مامی سے ملنے گیا تو گھر میں دو اور عورتیں تھیں، محمد سلیمان سیٹا کی بیوی رابعہ بائی اور مجید سلیمان کی بیوی کھتو بائی۔ میری مامی نے کہا کہ مومن کے ساتھ تجویز اس کے والدین نے قبول کر لی اور مجھے مبارکباد دی۔ میں انکار میں تھا، مشکل سے یقین تھا کہ اس کے بعد سے میری زندگی ٹھیک ہونے والی ہے۔

میری شادی مارچ 1953 میں ہوئی اور میں اپنی مامی کے ساتھ رہنے لگا۔ میری ممانی نے چھ ماہ بعد، اس نے مجھے بلایا اور مجھے اس کے ساتھ بیٹھنے اور بات کرنے کو کہا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ یہ گھر اس کا نہیں ہے اور اگر وہ مر گئی تو مجھے سڑکوں پر نکال دیا جائے گا۔ میرے لیے بہتر تھا کہ میں اپنی جگہ حاصل کر لوں۔ میں نے ایک بروکر کے ساتھ رنچھور لائن میں اپارٹمنٹ تلاش کرنا شروع کیا اور 1500 روپے میں ایک جگہ مل گئی۔ میں نے اور بیوی نے اس نئے گھر کے لیے کچن کا سارا سامان خرید لیا اور میری ممانی کو کہا کہ اب ہم اپنا کھانا پکا سکتے ہیں۔

یہ میرا اپنا پہلا گھر تھا جس میں میں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ میرا بیٹا انور جنوری 1954 میں پیدا ہوا۔

1958 میں میرے بیٹے صمد کی پیدائش کے بعد مجھے خبر ملی کہ میرا بھائی غلام ابھی ہندوستان میں ہی راجکوٹ میں مقیم ہے۔ میرا ایک رابطہ امین گوڈیل میرے بھائی کی مدد کر رہا تھا۔ جو ٹرین اسٹیشنوں میں سے ایک پر رہ رہا تھا۔ چونکہ وہ بولنے سے قاصر تھا اس لیے لوگ اسے زندگی گزارنے کے لیے پیسے دیتے تھے۔ میں نے ہر ماہ 100 روپے زکریا کامدار کے ذریعے امین گوڈیل کو بھیجنے شروع کر دیے۔ آخر کار ایک دن امین گوڈیل نے مجھے ایک خط لکھا جس میں مجھے مشورہ دیا گیا کہ پیسے کی بجائے میرے بھائی کو گھر کی ضرورت ہے۔ لہذا میں نے 1962 میں بھارت جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے بھارت کے ویزے اسی وقت تیار ہو گئے جب میری بیوی نے میرے چھٹے بچے کو جنم دیا، ایک بیٹی جس کا نام ہم نے شیر بانو رکھا۔ وہ بہت بیمار اور کمزور تھی، اور میں نے اپنی بیوی اور اس کے ایک بھائی کو نصیحت کی کہ اگر خدا نہ کرے، وہ میری غیر موجودگی میں فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کا خیال رکھنا۔

چنانچہ میں ٹرین کے ذریعے ہندوستان روانہ ہوا۔ اگلی صبح سویرے ہم راجکوٹ پہنچے۔ میں تانگہ کو صدر کے علاقے میں امین گوڈیل کے دفتر لے گیا۔ صبح کے ساڑھے سات بجے تھے اور ظاہر ہے دفتر بند تھا۔ تانگہ والے نے کہا کہ وہ جانتا ہے کہ امین بھائی کا گھر کہاں ہے اور مجھے وہاں لے گیا۔ امین گوڈیل اور اس کا بھائی وہاں مقیم تھے۔ اس وقت ان کا خاندان پاکستان کے دورے پر تھا۔ مجھے بہت بھوک لگی تھی اور پوچھا کہ کیا انہوں نے ناشتہ کیا ہے؟ امین بھائی نے مسکرا کر ایک خاتون ورکر کو ناشتہ تیار کرنے کو کہا، جب ان کا بھائی مکھن خریدنے گیا تھا۔ ہم نے گرم چائے کے ساتھ اچھا ناشتہ کیا۔ صبح 9 بجے کے قریب ہم دفتر کے لیے روانہ ہوئے۔ امین بھائی نے بتایا کہ میرا بھائی عموماً صبح اپنے گھر پانی پینے کے لیے آتا تھا۔ ہم

ساری صبح انتظار کرتے رہے لیکن اس دن وہ نظر نہیں آیا۔ ہم دوپہر کا کھانا کھا کر گھر کے لیے روانہ ہوئے اور تھوڑا آرام کرنے کے بعد دفتر کی طرف چلنا شروع کیا۔ جب ہم راستے میں تھے تو میں نے اپنے بھائی کو ہماری طرف آتے دیکھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی، پھٹے کپڑے اور پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ اس نے فوراً مجھے پہچان لیا اور مسکرا دیا۔ میں رو پڑا کیونکہ اس نے مجھے ایک بہت بڑے عرصے کے بعد دیکھا تھا، گلے لگایا اور مجھے جانے نہیں دیا۔ امین بھائی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں، کہ میں اپنے بھائی کو دیکھ کر خوش ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ اسے نہیں معلوم کہ میرا بھائی مجھے اپنی اشاروں کی زبان سے کیا کہہ رہا ہے۔ وہ مجھے ہر جگہ تلاش کر رہا تھا۔

اس کے پاؤں بہت تھکے ہوئے تھے. امین بھائی نے مجھے تنبیہ کی کہ ابھی ان کے ساتھ نہ چلوں کیونکہ اگر مقامی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ آپ کا بھائی ہے تو وہ ہمارے دشمن بن جائیں گے۔ میرا بھائی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ چونکہ وہ بہرا تھا اور بول نہیں سکتا تھا، اس لیے مقامی لوگ اسے سارا دن پیسے دیتے تھے۔ مقامی ٹھگ پھر رات کو اس کے سوتے وقت اس سے اس کی ساری رقم لے لیتے تھے۔

ہم ایک چائے والا کے پاس رکے۔ میرا بھائی میرے پیچھے چل رہا تھا۔ جیسے ہی ہم ہوٹل میں داخل ہوئے، ویٹر نے میرے بھائی کو دور رہنے کے لیے چیخنا شروع کر دیا۔ جب میں نے ویٹر کو بتایا کہ وہ میرا بڑا بھائی ہے تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس ناروا سلوک پر بہت معذرت خواہ ہیں۔ چائے پینے کے بعد ہم واپس دفتر آگئے۔ میرے بھائی غلام نے مجھ سے ہمارے بھائی عثمان اور ہماری بہن رابعہ کے بارے میں پوچھا۔ ہم مسلسل اشاروں کی زبان میں بات کر رہے تھے، امین بھائی حیران رہ گئے۔ میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ عثمان اس وقت ڈھاکہ میں تھا جبکہ رابعہ شادی شدہ تھی اور رنگون میں رہتی تھی۔

امین گوڈیل بہت متاثر ہوئے اور وہ مجھ سے پوچھتے رہے کہ کیا میں سمجھتا ہوں کہ میرا بھائی مجھے اشاروں کی زبان میں کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی ہر بات کو سمجھتا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ میرے بھائی کا امتحان لینا چاہتا ہے؟ اس نے ہاں کہا اور اس کے لیے دو سگریٹ خریدنے کو کہا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ کسی برانڈ کی وضاحت کرے تو میرا بھائی صرف اسی قسم کی خریداری کرے گا۔ تو اس نے مجھ سے کیونڈر برانڈ کے دو سگریٹ خریدنے کو کہا۔ میں، بدلے میں، اشاروں کی زبان میں اپنے بھائی سے دو کیونڈربرانڈ کے سگریٹ خریدنے کو کہتا ہوں۔

یقینی طور پر، میرا بھائی صحیح سگریٹ اور تبدیلی دونوں کے ساتھ چند منٹوں میں واپس آگیا۔ ایک سبق جو میں نے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ کسی انسان کو صرف اس لیے پاگل نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معذور ہے۔ اسی علامت سے اگر کوئی پاگل ہو گیا ہے تو اس کی وجہ ذہنی بیماری ہے، ڈپریشن اور کچھ دیگر نفسیاتی مسائل کی وجہ سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ مناسب طبی علاج سے، کوئی بھی نارمل ہو سکتا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

اگلے دن میں اپنی واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بھائی کا پاسپورٹ تیار کرنا تھا۔ میں جتنی جلدی ہو سکتا تھا ھندوستان چھوڑنا چھاتا تھا۔

امین گوڈیل اور میں صبح دفتر کی طرف چل رہے تھے کہ ہم نے ایک بڑی عمر ہندو خاتون گلی کے نکڑ پر کھڑکی کسی کا انتظار کر رہی تھی ۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کھانا تھا۔ امین گوڈیل نے مجھے بتایا کہ یہ عورت گرمی میں کھڑی روز تمھارے بھائی کا انتظار کرتی ھے تاکہ وہ اسے کھانا فراہم کر سکے۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا

وہ دھوپ میں کیوں کھڑی تھی؟

اس نے نرمی سے جواب دیا کہ وہ بہرے کے آنے کا انتظار کر رہی ہے تاکہ وہ اسے کھانا دے سکے۔ تب مجھے احساس ہوا اور میرا ایمان پختہ ہو گیا کہ اللہ اپنی تمام مخلوقات کو بغیر کسی تعصب کے رزق دیتا ہے۔ بس ہمارا ایمان ہی اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی برسات کے دنوں میں اپنا سارا بھروسہ اپنے بچوں یا گھر والوں پر ڈال دیتے ہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد امین گوڈیل نے میرا تعارف ایک وکیل سے کرایا جس کا نام قاسم بھائی تھا۔

جب میں اس سے بات کرنے لگا تو اس نے مجھے بورڈنگ اسکول سے پہچان لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے بھائی غلام احمد جان کو اپنے ساتھ پاکستان لے جانے آیا ہوں۔ جب اس نے میرے بھائی کو دیکھا تو کہا کہ میں اسے جانتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ وہ واقعی ہندو ہے۔ مجھے اسے قائل کرنا پڑا کہ وہ ہمارا سب سے بڑا بھائی تھا، جو بچپن میں سماعت سے محروم ہو گیا تھا اور حقیقت میں مسلمان تھا۔ ایک مقامی ہندو پادری کے چند ضروری دستخطوں کے لیے قاسم بھائی کافی مہربان تھے۔

ہمیں اگلے دو دنوں میں میرے بھائی کا پاسپورٹ مل گیا جس میں پاکستان کا ویزہ بھی شامل تھا۔ میں نے امین گوڈیل سے فوراً کہا کہ ہم پاکستان کے لیے ٹیک آف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور میسانہ، انڈیا کے لیے ٹرین پکڑی۔ سفر کے دوران، میں نے اپنے بھائی کو اپنے اوپر والے بستر پر سولایا تھا۔ لیکن اگرچہ میں بھی بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا، مجھے سونے سے ڈر لگتا تھا، اس لیے میں نے سامنے والی نشستوں پر بیٹھے ہندو جوڑے سے کہا کہ وہ میرے بھائی پر نظر رکھیں تاکہ میں کچھ سو سکوں۔ اگلے دن ہم میسانہ میں تھے۔ وہاں سے ہم نے حیدرآباد/کراچی کے لیے ٹرین پکڑی۔ ہم 4:30 یا 5:00 بجے کے قریب کراچی پہنچے۔ وہاں سے ہم نے ایک رکشہ گھر لے لیا۔ گھر آکر اچھا لگا، خاص طور پر جب مجھے پتہ چلا کہ میری بیمار بیٹی شیر بانو بہت بہتر محسوس کر رہی ہے اور گھر والوں نے اس کا نام بدل کر یاسمین رکھ دیا ہے۔

میرے بھائی کو پروسٹیٹ کے ساتھ مسئلہ تھا اور رات کو کئی بار بیت الخلاء جانا پڑتا تھا۔ ہم ایک بہت ہی چھوٹے سے کمرے کے فلیٹ میں رہ رہے تھے اور اس کے بار بار کے دورے پورے خاندان کے لیے بہت پریشان کن تھے۔ میری بیوی اس قدر پریشان تھی کہ آخر کار میں نے اسکا گھر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا، جو کہ ستار ایدھی کی بولٹن مارکیٹ کے قریب واقع ہے۔ کچھ مہینوں بعد، میں اسے حیدرآباد کے دماغی اسپتال میں داخل کروانے میں کامیاب ہوگیا۔ بے شک وہ پاگل نہیں تھا لیکن کسی سے بات یا سن نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس نے وہاں بہت مطمئن زندگی گزاری۔ اس دوران میں تھوڑی بڑی جگہ کے لیے دعا کر رہا تھا تاکہ میں اپنے بھائی کو ہمارے ساتھ رہنے کے لیے گھر واپس لا سکوں۔ آخرکار ایک دن میں آرام باغ کے قریب ایک نئے گھر کے لیے رقم جمع کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ فلیٹ ابھی زیر تعمیر تھا، اور مجھے بتایا گیا کہ اسے مکمل ہونے میں چند ماہ لگیں گے۔

میرا بیٹا انور ڈی جے میں انٹر سائنس میں تھا۔ کالج میں جب اس نے مجھے بتایا کہ اس کا امریکہ کا ویزا تیار ہے اور اسے ٹکٹ خریدنے اور اس کا تبادلہ کرنے کے لیے 8500 روپے درکار ہوں گے۔ میں نے نئے فلیٹ کی خریداری کے لیے صرف اتنی رقم بچائی تھی، لیکن میں یہ موقع لینے اور انور کو امریکا بھیجنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے فلیٹ پر اپنی جمع رقم کی واپسی حاصل کی اور اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ سفر کی تیاری کرے۔ جب وہ اپنی تیاری کر رہے تھے، ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے پاکستانی کرنسی کی قدر میں کمی کا اعلان کیا۔ اس سے اخراجات بڑھ کر 18,000 روپے ہو گئے۔ کوئی بھی میرے بیٹے کی رخصتی کے لیے رقم کے ساتھ ہماری مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جب میں نے اپنے بھتیجے زکریا موتن

کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے بیٹے انور کو اپنے ایک دوست سردار محمد سے ملنے کے لیے بھیجوں جو کراچی میں قالین کا کاروبار کرتا تھا۔ جب سردار صاحب کو ضرورت کا علم ہوا تو انہوں نے ہمیں سفر کے لیے درکار اضافی دس ہزار روپے فوراً دے دیے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر میں اتنی رقم واپس نہ کر سکوں تو کیا ہو گا۔ سردار صاحب بڑے شفیق نوجوان تھے اور مجھ سے کہا کہ فکر نہ کرو۔ اگر میں ادائیگی کرتا ہوں، تو اس نے کہا، آپ جو رقم واپس کریں گے وہ انور جیسے دوسرے بچوں کی مدد کے لیے میرے دادا کے تعلیمی فنڈ میں واپس جائے گی۔

چنانچہ انور مئی 1972 میں شکاگو کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں کل وقتی کام کرتے ہوئے اسکول میں داخلہ لیا۔ اس نے ساری رقم سردار صاحب کو واپس کر دی اور ساتھ ہی ہمیں کافی مدد بھی کی جس سے اور رنچھوڑ لائنز کے گھر کو بیچنے سے آدم جی نگر میں ایک جگہ 22,000 روپے میں خرید لی۔

اگست 1973 میں انور نے کراچی کا دورہ کیا، مجھ سے وعدہ کیا کہ اب مزید کام نہیں کریں گے، کیونکہ وہ ہر ماہ پیسے بھیجیں گے۔ آپ آج 1996 میں میرا انٹرویو کر رہے ہیں۔ انور نے ہمارے ماہانہ اخراجات کی ادائیگی بند نہیں کی، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے، اس کی شادی ابراہیم شاذ باوانی کی بیٹی یاسمین سے ہوئی ہے اور اس کے دو بچے ہیں، شرمین اور نعمان۔ ان دنوں وہ سعودی عرب میں ریاض کے سب سے بڑے ہسپتال کنگ فیصل سپیشلسٹ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں بطور کنسلٹنٹ کام کر رہے ہیں۔

کچھ سالوں کے بعد 1982 کے اوائل میں میں پہلی منزل پر ایک اور فلیٹ 17,000 روپے میں خرید سکا اور اپنے بھائی کو اس نئے فلیٹ میں ہمارے ساتھ رہنے کے لیے حیدرآباد سے واپس لایا۔ میرا بھائی نیچے زکریا بھائی کی کپڑے کی دکان کے پاس بیٹھ کر اپنی زندگی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک دن، اس نے پیٹ میں تکلیف کی شکایت کی اور اس کے پاجامے پر داغ پڑ رہے تھے۔ میں نے نیچے کپڑے کی دکان میں زکریا بھائی سے اس پر بات کی، اور انہوں نے مجھے اندر کی کہانی سنائی۔ انہوں نے کہا کہ یہاں کے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ کسی بہرے کو کھانا کھلائیں تو ان کی قسمت بدل جائے گی۔ مقامی لوگوں میں سے ایک میرے بھائی کو بھنے ہوئے چنے دے رہا تھا اور صدیق لاکھانی کی بیوی زبیدہ روزانہ کھانا فراہم کر رہی تھی۔ یہ غیر معمولی عادت میرے بھائی کے نظام انہضام کو پریشان کر رہی تھی۔ مجھے ان دونوں کو پکڑنا تھا اور ان میں سے ہر ایک سے درخواست کرنی تھی کہ وہ جو کچھ کر رہے تھے اسے روک دیں۔

میرا بھائی تھوڑا موٹا تھا، اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اسے روزانہ فجر کی نماز کے بعد سیر کروایا جائے۔ ایک دن جب ہم سیر سے واپس آ رہے تھے تو میں اپنے بھائی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بعد میں، میں اسے ایدھی کے مقام پر ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ پولیس نے اسے اٹھا لیا ہوگا، جب انہوں نے جیب میں ایدھی کا کارڈ دیکھا تو وہ اسے ایدھی کے گھر لے گئے۔

یحییٰ ہاشم باوانی جنہوں نے محمد عبدالکریم موتن کا مذکورہ بالا انٹرویو کیا تھا اس میں بھی اپنے خوبصورت خیالات کی چند سطریں درج ذیل ہیں

میرا نام یحییٰ ہاشم باوانی ہے اور میں نے اپنے دوست محمد عبدالکریم موتن کا انٹرویو کیا، جو ایک خود ساختہ شخص تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات، اتار چڑھاؤ سے گزرے تھے، پھر بھی ان کی سوچ کا مرکزی خیال یہ تھا کہ انسان کو زندگی میں اپنے مسائل کے بارے میں اتنی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ انہیں سخت محنت کرتے رہنا چاہیے اور اپنی زندگی میں خوش رہنا چاہیے۔ ہم اس کے ساتھ بیٹھتے اور کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے، اور میں نے ہمیشہ اس کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراہٹ دیکھی۔ اس نے زندگی سے کبھی ہار نہیں مانی اور اللہ نے ہمیں اس زندگی میں جو کچھ دیا ہے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انہیں اشعار (اردو زبان میں اشعار) سنانے کا شوق تھا۔

کبیرا تیری کٹیا گل گتیوں کے ساتھ جو ہونا تھا سو ہو گا تو کاہے کو اداس

ان کے پسندیدہ اشعار کا مفہوم یہ تھا کہ اگر تم بری صحبت پر مجبور ہو تو بے چین اور افسردہ نہ ہو، بس ان لوگوں کے برے کاموں میں ساتھ نہ دو اور اپنے کام کو ذہن میں رکھو۔

کون سہ سکتا ہے حیات جاویداں کی تلخیاں زندگی پر موت کا کتنا بڑا احسان ہے

میرا دوست محمد اپنے بچوں، اپنی بیوی مومن بائی کے ساتھ ساتھ اپنے بھائیوں غلام اور عثمان سے پیار کرتا تھا اور اس نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی تاکہ خاندان میں حسنِ سلوک قائم رہے۔ ان کی زندگی کو دیکھ کر مجھے شاعر اقبال کا ایک شعر یاد آتا ہے

نگہ بلند سخن دل نواز جان پرسوز یہ ہے رکتے سفر میر کاروان کے لیے

وہ بہت ایماندار آدمی تھے اور انہوں نے کبھی کسی کو دھوکہ دینے یا رشوت دینے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ، وہ کسی بھی معیار کے لحاظ سے غریب تھا لیکن خیرات کی ادائیگی سے کبھی باز نہیں آیا۔ وہ کبھی بھی کسی کو نہیں بھولتا تھا جس نے اس کے ساتھ اچھا کیا تھا اور ہمیشہ کوشش کی تھی کہ وہ جتنا ہو سکے واپس لوٹایا۔

میری درخواست ہے کہ جس نے بھی میرے دوست محمد عبدالکریم موتن کا میرا انٹرویو پڑھا یا سنا ہے، ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین وما علینا البلاغ۔

# CHAPTER 10

## LESSONS LEARNED

ہم سب اگلے دن یعنی 14 فروری 1964 کو ہونے والی عید کے لیے اپنے کپڑے اور جوتے تیار کر رہے تھے۔ اس وقت ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ امریکہ میں ویلنٹائن ڈے ہے۔ عید کی رسومات، عید کی نماز، اور شاندار ناشتے کے بعد، ہم چار بھائیوں نے اپنے والد کے ساتھ باہر جانے کی تیاری کی۔ ہمارا پہلا پڑاؤ ہماری نانی کا گھر تھا جہاں ہم ان سے اور اپنے ماموں سے ملتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک روپے کا روایتی تحفہ ہمارے والد ٹھکرا دیتے جو میری غریب نانی کی مالی حالت کو سمجھتے تھے۔ ہمارا اگلا پڑاؤ میرے ابا کی خالہ مومن مامی کا پاک مینشن کے علاقے میں تھا۔ وہ بہت ہی مہربان خاتون تھیں جو ہمیشہ ہم میں سے ہر ایک کو دو روپے کے بالکل نئے نوٹ دیتی تھیں۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد میرے والد نے ہمیں اسے رکھنے کی اجازت دی۔ اگلا پڑاؤ آیور مامی کا گھر تھا، جو میرے والد کی ایک اور خالہ تھیں۔ وہاں سے، ہم اپنے والد کے کزن بھا غفار اور ہاشم شکور موتن سے ملنے جاتے۔ ایک بار جب ہم ان کے اپارٹمنٹ کی عمارت سے نکلتے تو والد صاحب ریڈیو ہوٹل میں چائے کا اسٹاپ کرتے، جو بالکل ساتھ ہی تھا۔ ہم چاروں کو جہاز کی شکل کا کیک ملتا، جس سے ہم بہت لطف اندوز ہوتے۔ ریڈیو ہوٹل کے باہر بیٹھنے کی ایک بڑی جگہ تھی جہاں تمام بوڑھے میمن چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہانیاں، لطیفے اور اپنی غلط مہم جوئی کی کہانیاں سناتے تھے۔ ابا اپنے تفریحی وقت میں سے کچھ حصہ لے کر ہر ایک سے ہمارا تعارف کرواتے، ان کو ہمارے نام بتاتے اور کہتے کہ یہ آپ کے فلاں چچا ہیں، گویا ہمیں یاد ہوگا۔ جب ہم ان لوگوں سے مل رہے تھے اور بات کر رہے تھے، میرے والد نے اپنے ایک دوست کو ہم چاروں کی دیکھ بھال کرنے کو کہا اور تیزی سے جناح کیپ میں ایک آدمی کی طرف بھاگے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص بروکر غنی آدم جی تھا، جو ایک دلال تھا۔ والد اور غنی نے دلالی کی رقم پر جھگڑا شروع کر دیا یہاں تک کہ آخر کار دوسرے لوگوں نے مداخلت کی۔

۔اس کے بعد ہم جیت پور میمن ایسوسی ایشن کی طرف چل پڑے جو ریڈیو ہوٹل سے ایک میل کے فاصلے پر تھا

جب ہم ایسوسی ایشن پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ اپنے بچوں کے ساتھ تھے۔ ہم سب سے دوبارہ انہی رسومات میں ملنے پر مجبور ہوئے جیسے پہلے تھے۔ ایک ممتاز نوجوان عبداللہ کامدار جو انجمن کے جنرل سکریٹری تھے، انھوں نے اس موقع پر سب کو مبارکباد پیش کی اور تقریر کی۔ عمارت کے اندر جاتے ہی ہماری ملاقات میری والدہ کے ماموں لطیف سے ہوئی جو ہم پر بہت مہربان تھے۔ وہ ہمیں بہت خاموش رہنے کو کہتے ہوئے لائبریری میں لے گئے۔ مجھے ایک لائف میگزین اٹھانا یاد ہے کیونکہ اس میں بہت سی تصویریں تھیں۔ ہم اس وقت کسی حد تک انگریزی پڑھ سکتے تھے لیکن کچھ مشکل سے۔ لائف میگزین ۔میں صدر جان ایف کینیڈی کی تصویریں تھیں، جنہیں نومبر کے اوائل میں قتل کر دیا گیا تھا

میرے والد نے وضاحت کی کہ سابق نائب صدر جانسن اب سے صدر تھے۔ میگزین میں جاتے ہوئے مجھے ان کی 1963۔ تقریروں کے بہت سے اقتباسات نظر آئے۔ ایک اقتباس، جو مجھے اس وقت سمجھ نہیں آیا تھا لیکن جو مجھے بار بار یاد آرہا ہے وہ یہ تھا، "یہ مت پوچھو کہ آپ کا ملک آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے، بلکہ اپنے آپ سے پوچھیں کہ آپ اپنے ملک کے ۔"لیے کیا کر سکتے ہیں

بہت سالوں بعد، میں نے ان الفاظ کی تشریح کی کہ بدلے میں کسی چیز کی توقع کیے بغیر ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنا۔ خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے، اور میں ہمیشہ کام کرنے اور اپنے خاندان کی مدد کرنے کا موقع تلاش کرتا تھا۔ 1967 کے آخر تک، ہم 10 بہن بھائی، ماں، ابا، اور ایک چچا، خاندان کے کل 13 افراد تھے جن کی کفالت ایک مزدور، میرے والد صاحب کرتے تھے۔ یہ ہماری زندگی کا سب سے مشکل وقت تھا۔ والد کبھی بھی کافی رقم کمانے کے قابل نہیں تھے۔ تقریباً ہر صبح وہ ہم میں سے ایک بھائی سے کہتے کہ وہ جا کر محلے کے ایک دکاندار سے 10 بعد میں 20 روپے ادھار لے تاکہ ہم دن کے لیے کچھ کریانہ خرید سکیں۔ میں نے پاکستان میں کام کیا لیکن صرف رمضان یا گرمیوں کی چھٹیوں میں اور اپنے خاندان کی کفالت کے لیے کافی نہیں کیا۔ ایک بار جب میں امریکہ میں تھا، میں نے کبھی بھی اپنے خاندان کو پیسے بھیجنا بند نہیں کیا۔ میری شادی کے بعد، میں نے زندگی بھر کی عادت اپنا لی کہ ہر ماہ اپنے گھر والوں کو باقاعدگی سے رقم بھیجتا رہوں۔ اس کا کریڈٹ واقعی میری بیوی کو جاتا ہے، جس نے ہمیشہ اس بات کو یقینی بنایا کہ میرے والدین مالی طور پر اچھے اور خوش ہوں۔ اگرچہ میرے والد کا 1998 میں انتقال ہو گیا تھا لیکن میری والدہ کے اخراجات کم ہونے کے بجائے 150 ڈالر ماہانہ سے بڑھ کر 500 ڈالر ماہانہ ہو گئے ہیں اور اللہ نے مجھے ہمیشہ کئی گنا ادا کیا ہے۔ ماں ہمیشہ خوش رہتی ہے اور اب

پاکستان واپس آنے اور امریکہ جانے کی اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے بعد سکون میں تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ نے مشکلات اور مشکل وقت سے گزرنے کے بعد اپنا سبق سیکھا ہے۔ یہاں سال 2016 کے آخر میں، 9 دسمبر کو ریٹائر ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے، میں اپنی زندگی میں سیکھے ہوئے اسباق کو جمع کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ میرے بعد آنے والی نسلیں میری غلطیوں سے سیکھ سکیں اور اپنی زندگیوں سے لطف اندوز ہو سکیں

ہمیشہ اس پر توجہ مرکوز رکھیں جو آپ کو صحیح لگتا ہے، اور کبھی بھی دوسروں پر توجہ نہ دیں جن کا آپ کی زندگی میں کوئی کاروبار نہیں ہے۔

اپنی آمدنی کا کچھ حصہ ہمیشہ خیراتی اداروں کے لیے مختص کریں، جو گھر سے شروع ہوتا ہے (خاص طور پر آپ کے والدین کے ساتھ)۔ اللہ آپ کو کئی گنا بدلہ دے گا۔

حلال کمانا (مذہبی اقدار کی اصطلاح میں قانونی) آسان نہیں ہے، لیکن اگر آپ اس مقصد کے لیے سخت محنت کرتے ہیں، تو آپ ہمیشہ مالی طور پر مستحکم رہیں گے۔ اگر آپ کی کمائی کم ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن حلال کو جاری رکھنے سے آپ ہمیشہ خوش رہیں گے۔

دوستوں اور خاندان کے ساتھ کبھی بھی پیسہ نہ لگائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں، تو یقینی بنائیں کہ آپ اسے خرچ کے طور پر لکھتے ہیں اور اسے بھول جاتے ہیں۔

ہمیشہ خاندان کے افراد اور رشتہ دار ہوں گے جو آپ کے مقام، تعلیم اور معیار زندگی پر رشک کریں گے۔ کوئی توجہ نہ دینا۔ جو صحیح ہے کرو۔ اگر آپ اچھی حلال رقم کماتے ہیں تو آپ کو اس سے لطف اندوز ہونے کا حق ہے، لیکن صدقہ دینا نہ بھولیں۔

آپ کے شریک حیات ہمیشہ آپ کو اپنے والدین کی حمایت کرنے سے روکیں گے (میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے ساتھ اس کے برعکس ہے)، لیکن یاد رکھیں، تمام ابراہیمی مذاہب، اسلام، عیسائیت اور یہودی ہمیشہ صدقہ کو ایک خوبی کے طور پر زور دیتے ہیں۔

کبھی بھی مجرم محسوس نہ کریں، آپ کی ذمہ داری اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب آپ کے بچے 18 سال یا اس سے زیادہ ہو جائیں اور اپنا ہائی سکول مکمل کر لیں۔ انہیں اپنا سامان خود اٹھانا ہوگا جیسا کہ آپ نے اٹھایا تھا۔

جب آپ جوان ہوں تو سست نہ ہوں۔ 18 سال کی عمر سے لے کر کم از کم 62 سال کی عمر تک جتنی محنت کر سکتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب آپ کے پاس اپنے بڑے بچوں سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہوتا ہے اور ان کے ساتھ اپنا قیمتی وقت ان کے مستقبل کی تشکیل کے لیے گزارتے ہیں۔

دعا کوئی "فالتو پہیہ" نہیں ہے جسے آپ مشکل میں نکالتے ہیں، بلکہ یہ ایک "اسٹیئرنگ وہیل" ہے جو زندگی میں صحیح راستے پر چلاتا ہے۔

دوستی ایک کتاب کی طرح ہے۔ اسے جلنے میں چند سیکنڈ لگتے ہیں، لیکن لکھنے میں برسوں لگتے ہیں۔

زندگی کی تمام چیزیں عارضی ہیں۔ اگر وہ ٹھیک چل رہی ہیں تو ان سے لطف اندوز ہوں، وہ ہمیشہ کے لیے نہیں رہیں گے۔ اگر وہ غلط ہو رہے ہیں تو پریشان نہ ہوں، وہ بھی زیادہ دیر نہیں چل سکتے۔

پرانے دوست سونا ہوتے ہیں! نئے دوست ہیرے ہیں! اگر آپ کو ہیرا مل جائے تو سونا مت بھولنا! ایک ہیرے کو پکڑنے کے لیے، آپ کو ہمیشہ سونے کی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

اکثر جب ہم امید کھو بیٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ انجام ہے، اللہ اوپر سے مسکراتا ہے اور کہتا ہے، "آرام کرو، پیارے! یہ صرف ایک موڑ ہے، اختتام نہیں۔

جب اللہ آپ کے مسائل حل کرتا ہے تو آپ کو اس کی صلاحیتوں پر بھروسہ ہوتا ہے۔ جب اللہ آپ کے مسائل حل نہیں کرتا تو اسے آپ کی صلاحیتوں پر بھروسہ ہوتا ہے۔

ایک نابینا شخص نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا: کیا بینائی سے محروم ہونے سے بھی بدتر کوئی چیز ہوسکتی ہے؟ اس نے جواب دیا: "ہاں، آپ کی بینائی کھو رہی ہے۔

جب آپ دوسروں کے لیے دعا کرتے ہیں تو اللہ آپ کی سنتا ہے اور انہیں برکت دیتا ہے، اور کبھی، جب آپ محفوظ اور خوش ہوتے ہیں، یاد رکھیں کہ کسی نے آپ کے لیے دعا کی ہے۔

فکر کل کی پریشانیوں کو دور نہیں کرتی۔ یہ آج کا سکون چھین لیتا ہے۔

آخری لیکن کم از کم، میری اپنی زندگی کا ایک بہت اہم سبق یہ کہ ہم نے اپنے بچوں کو اپنی زندگی خود جینے کی اجازت دی۔ میں اور میری اہلیہ دونوں کو جب بھی کسی کی ضرورت ہوتی تھی مشورہ دینے کے لیے وہاں موجود ہوتے تھے۔ دونوں بچوں نے اپنی زندگی میں جو بھی اہم تھا اس کا انتخاب کیا جس سے وہ خوش ہوئے۔ زندگی میں خوشی صرف پیسہ حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ ہمیں اپنی اگلی نسل کو ان کی زندگی میں خوش رہنے کے لیے فراہم کرنا چاہیے اور ان میں سے ہر ایک کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھی پیشہ کا انتخاب کر سکے جو انھیں اپنی زندگی میں خوش رکھے۔ نتیجہ ہمارے لیے واضح تھا، پھر بھی ہم نے دعویٰ کیا کہ دونوں بچے اپنی زندگی میں خوش ہیں۔

## میرے آخری خیالات

یہ چند عظیم مسلمانوں کی چند عظیم تحریروں اور اس زمین پر رہنے سے متعلق میرے اپنے خیالات کا مجموعہ ہے۔ ہم سب کے لیے یہ تسلیم کرنا بہت ضروری ہے کہ ہم سب انسان ہیں اور سب کے جذبات ایک جیسے ہیں۔ اگر آپ اپنی زبان سے کسی کو تکلیف دیتے ہیں، یعنی اسے مارنا، برا بھلا کہنا یا اس کے خلاف لکھنا بھی اس کا اس شخص پر دیرپا برا اثر پڑے گا۔ ہمیں ایک دوسرے کا احترام کرنا اور ان کے نقطہ نظر کو سننا سیکھنا چاہیے۔ آپ کسی ایسے شخص سے ملیں گے جو آپ کا دشمن بن جائے گا چاہے آپ اس شخص کے لیے کچھ بھی کریں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہمیں اپنی مشترکہ انسانیت کو سمجھنے کے لیے اپنے دشمن کی مدد کرنے کی کوشش سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔ رنگ، عقیدہ یا مذہب کی کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ اکثریت کسی نہ کسی خالق پر یقین رکھتی ہے، اور ملحد بھی کبھی کبھی سوچتے ہوں گے کہ یہ کائنات کیسے بنی؟ نہ صرف یہ کائنات، ہم نے سیکھا ہے کہ بہت سی کائناتیں ہیں جنہیں کہکشائیں کہتے ہیں اور کہکشاؤں کے بہت بڑے جھرمٹ ہیں۔

ہم آکاشگنگا میں رہتے ہیں، ان کہکشاؤں میں سے ایک جس میں ہمارے سورج جیسے اربوں ستارے ہیں، جو ہمارے نظام شمسی کے مرکز میں واقع ہے۔ صفت "دودھائی" اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ کہکشاں زمین سے کیسے ظاہر ہوتی ہے - رات کے آسمان میں روشنی کا ایک بینڈ ستاروں سے بنتا ہے جسے ننگی آنکھ سے انفرادی طور پر نہیں پہچانا جا سکتا۔ آکاشگنگا ۔بہت سی کہکشاؤں میں سے صرف ایک ہے

آکاشگنگا ایک ممنوعہ سرپل کہکشاں ہے جس کا قطر 100,000 نوری سال اور 180,000 نوری سال کے درمیان ہے۔ ایک اندازے کے مطابق آکاشگنگا میں 100-400 بلین ستارے ہیں۔ آکاشگنگا میں شاید کم از کم 100 بلین سیارے ہیں۔ نظام شمسی ڈسک کے اندر واقع ہے، کہکشاں مرکز سے تقریباً 26,000 نوری سال کے فاصلے پر، گیس اور دھول کے سرپل نما ارتکاز میں سے ایک کے اندرونی کنارے پر جسے اورین آرم کہتے ہیں۔ اندرونی ≈10,000 نوری سالوں میں ستارے ایک بلج اور ایک یا زیادہ سلاخیں بناتے ہیں جو بلج سے نکلتے ہیں۔ بالکل مرکز کو ایک شدید ریڈیو ذریعہ سے نشان زد کیا گیا ہے، ۔ہے، جو ممکنہ طور پر ایک زبردست بلیک ہول ہے Sagittarius A* جس کا نام

ستارے اور گیسیں تقریباً 220 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے کہکشاں مرکز کے مدار سے وسیع فاصلے پر ہیں۔ مسلسل گردش کی رفتار کیپلرین ڈائنامکس کے قوانین سے متصادم ہے اور یہ بتاتی ہے کہ آکاشگنگا کا زیادہ تر حصہ برقی مقناطیسی تابکاری کو خارج یا جذب نہیں کرتا ہے۔ اس بڑے پیمانے کو "تاریک مادہ" قرار دیا گیا ہے۔ گردشی دور سورج کی پوزیشن پر تقریباً 240 ملین سال ہے۔ کہکشاں کے اضافی فریموں کے حوالے سے مجموعی طور پر آکاشگنگا تقریباً 600 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ آکاشگنگا کے قدیم ترین ستارے تقریباً اتنے ہی پرانے ہیں جتنے خود کائنات اور اس طرح غالباً بگ ۔بینگ کے تاریک دور کے فوراً بعد تشکیل پائے تھے

۔آکاشگنگا میں کئی سیٹلائٹ کہکشائیں ہیں اور یہ مقامی گروپ کا حصہ ہے

۔کہکشائیں، جو کہ کنیا سپر کلسٹر کا ایک جزو ہے، جو خود ایک ہے

سپر کلسٹر کا جزو۔ کائنات سمجھنے کے لیے پہلے ہی بہت بڑی تھی۔ لیکن سائنسدانوں نے ابھی پتہ چلا کہ Laniakea یہ دراصل اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے جتنا ہم نے پہلے سوچا تھا۔ ایک نئی تحقیق کے مطابق، قابل مشاہدہ کائنات کم از کم

دو ٹریلین کہکشاؤں سے بنی ہے نہ کہ 100 ارب کہکشاؤں سے، جیسا کہ پہلے سوچا گیا تھا۔ یہ اس سے 20 گنا زیادہ ہے جو پہلے سوچا گیا تھا۔ اگر انسان روشنی کی رفتار سے 300,000 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اڑنے کے قابل بھی ہو جائے تو آج انہیں ان کہکشاؤں کے مرکز یا اس سے آگے تک پہنچنے میں لاکھوں سال لگیں گے۔ تو آپ کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ کوئی خالق ہے جو ان تمام عجائبات کا ذمہ دار ہے۔

ہر چند سو یا ہزاروں سالوں میں انسانوں کو کوئی نہ کوئی ایسا شخص ملا ہے جس نے مذہب کی حدود میں رہتے ہوئے ان معاشروں کے لوگوں کو پرامن زندگی گزارنے میں مدد کی۔ یہاں ایک چھوٹا سا چارٹ ہے جس میں ان انبیاء کی آمد کو دکھایا گیا ہے جنہوں نے انسانیت کو امن سے رہنے کی تلقین کی۔

پھر بھی انسان آسانی سے بھول جاتے ہیں اور اپنے ہی بھائیوں اور بہنوں کو اتنی آسانی سے تباہ کر دیتے ہیں، گویا وہ صرف وہی ہیں جو جینے کا حق رکھتے ہیں۔

بہتر معلومات کی خاطر، ہم بہت سے ذرائع سے جانتے ہیں کہ آدم پہلے انسان تھے جو اس زمین پر اپنی بیوی حوا کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ ہر چند سال بعد، اللہ نے اپنے نبیوں میں سے ایک کو بھیجا تاکہ انسانوں کو اس زمین پر ہمارے اصل مقصد کی یاد دلائیں، نوح سے صالح سے لے کر ابراہیم تک۔ اب تک تقریباً 124,000 پیغمبر بھیجے جا چکے ہیں۔ ابراہیم کے دو بیٹے تھے، اسماعیل (بڑے) اور اسحاق۔ اسحاق نسب سے یعقوب (ان کا لقب اسرائیل تھا) اپنے 12 بیٹوں کے ساتھ آیا۔ ایک صاحبزادے حضرت یوسف علیہ السلام تھے جو سب سے چھوٹے تھے۔

اس کے بڑے بھائیوں نے برا سلوک کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان بارہ بھائیوں میں سے ایک عمران نامی کے ہاں پیدا ہوئے۔

موسیٰ علیہ السلام یہودیوں کے نبی ہیں اور یہ بات مشہور ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے سلسلہ نسب سے بہت سے نبی پیدا ہوئے جبکہ دوسری طرف اسماعیل علیہ السلام کے سلسلہ میں کئی سالوں تک کوئی نبی پیدا نہیں ہوا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کئی سالوں کے بعد نسب اسماعیل میں پیدا ہوئے۔

ابراہیمی مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام حضرت ابراہیم کی تعلیمات سے آتے ہیں اور کس طرح ان کی اولاد نے مذہبی علم اور افکار کو بہتر بنایا اور اجتماعی طور پر فقہ کو قائم کیا۔ فقہ قانون کا مطالعہ اور نظریہ ہے۔ اس میں قانون کے پیچھے وہ اصول شامل ہیں جو قانون کو قائم کرتے ہیں۔ فقہ کے اسکالرز، جنہیں فقہا یا قانونی تھیوریسٹ بھی کہا جاتا ہے، امید کرتے ہیں کہ وہ قانون کی نوعیت، قانونی استدلال، قانونی نظاموں اور قانونی اداروں کے بارے میں گہرائی سے فہم حاصل کریں گے۔

پھر مختلف لوگوں میں مذہب کی تقسیم ان کے معاشروں کے فائدے کے لیے ہوئی۔ ہر ثقافت نے تبدیلیوں کو ڈھال لیا اور ہر ایک کے پیروکار تھے۔ اسلام میں بھی ایسا ہی ہوا۔ کچھ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی مسلمان (اسلام کے پیروکار) نہیں ہیں، لیکن صرف یہ کہ ان کا نام بدل کر شیعہ، سنی، دیو بندی، بریلوی، وہابی وغیرہ رکھا گیا ہے۔

آیئے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے 80 سال بعد کے وقت کی طرف واپس چلتے ہیں۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بھی صحابی زندہ نہیں بچا تھا۔ ایسے لوگ تھے جنہوں نے صحابہ کو دیکھا اور ان سے ملاقات کی۔ اس وقت امام ابو حنیفہ یا امام مالک یا امام جعفر صادق بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ فقہ لکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس بار احادیث پر کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی اور امام بخاری یا امام مسلم مزید 125 سال تک پیدا نہیں ہونے والے تھے۔ دیو بندی، بریلوی اور وہابی جیسے مختلف فرقے قائم ہونے سے 1250 سال دور تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو لکھنے کا کوئی سوچ بھی نہیں رہا تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا کہ ''اگر تمہارے پاس قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے تو اسے مٹا دو''۔ مشہور ہے کہ خلیفہ ابوبکر اور عثمان نے احادیث پر مشتمل تمام تحریری دستاویزات کو تباہ کر دیا تھا۔ آخری حج کے دوران، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان سے قرآن کا حوالہ دینے اور دوسروں کو سمجھانے کی درخواست کی، چاہے وہ صرف ایک جملہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ بہت سے صحابہ کرام دین اسلام کی تبلیغ کے لیے مختلف ممالک کو روانہ ہوئے۔ بعض نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے دوران ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھا تھا، جب کہ بعض نے آپ کو اپنے پہلو میں چھوڑتے دیکھا تھا۔ ان طریقوں کو ان کے پیروکاروں نے اٹھایا۔ بعض نے اسے اپنے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے دیکھا (رفاع دین) جبکہ بعض نے اسے اپنے ہاتھ اپنی طرف رکھتے ہوئے دیکھا۔

اب آیئے مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے 120 سال بعد کی طرف لوٹتے ہیں۔ امام مالک اور امام جعفر صادق دونوں اس وقت موجود ہیں۔ وہ دونوں فقہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امام ابو حنیفہ بھی عراق میں

فقہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ ٹیلی ویژن یا انٹرنیٹ نہیں تھا، اور مدینہ اور عراق کے درمیان آگے پیچھے سفر کرنے میں مہینوں لگتے تھے۔ چند سال بعد امام شافعی آتے ہیں۔

فلسطین میں بھی یہی تحریر ہے جبکہ امام احمد بن جنبل بھی بغداد میں فقہ پر وسیع تحریر کرتے ہیں۔

اس کے بارے میں سوچیں. امام جعفر اور مالک مدینہ میں ہیں اور مسجد نبوی کے اندر لوگ دونوں روایات پر عمل پیرا ہیں۔ کچھ ہاتھ جوڑ رہے ہیں اور کچھ نماز کے وقت ان کے پہلو میں چھوڑ رہے ہیں۔

اس دوران نعمان بن ثابت (ابو حنیفہ) امام جعفر صادق کا شاگرد بننے کے لیے مدینہ آیئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مدینہ میں اس قدر مقبول ہو گئے کہ جب امام مالک ان سے ملتے تو اٹھ کر گلے لگا لیتے۔ امام جعفر ایک طرف ہاتھ رکھے ہوئے ہیں جبکہ امام ابو حنیفہ نماز میں ہاتھ ملا رہے ہیں۔ امام مالک سے جب کسی نے پوچھا کہ ابوحنیفہ سے ملنے کیوں کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا کہ اس شخص کی عزت کرنی چاہیے جو ہمارے نبی سے بہت پیار کرتا ہے۔ یاد رہے کہ امام مالک نے صرف ایک حج کیا اور مدینہ سے باہر جانے کو ترجیح نہیں دی کیونکہ وہ اس شہر سے باہر مرنے سے ڈرتے تھے۔ آپ نے ہر نماز مسجد نبوی میں پڑھی اور جوتا نہیں پہنا کیونکہ وہ اپنے جوتے کے قدم کسی ایسی جگہ پر رکھنے سے ڈرتے تھے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تھے۔

میں نے سینکڑوں بار دیکھا ہے کہ ایک ایک فرقہ دوسرے فرقے کو کافر کہتے ہیں۔ ان دنوں، بہت سے فرقے 10 اور 12 سال کے بچوں کو خودکش جیکٹ پہننے اور عبادت گاہوں - مساجد اور دوسرے فرقوں کے اسکولوں میں خود کو دھماکے سے اڑانے کی تعلیم دے رہے ہیں۔ کیا المیہ ہے؟ یہ اسلام نہیں ہے۔ اسلام کبھی کسی کو قتل کرنے کا درس نہیں دیتا۔ اسلامی عدالتیں فیصلہ کرتی ہیں کہ کس کو سزائے موت دی جائے اور یہ کہ سزا انسانی طور پر انجام دی جائے۔ یہ زیادہ قابل قبول ہے کہ ہمارے مذہبی اسکالرز قرآن سے مناسب علم اور اپنے بہترین فیصلے کو معاشرے کے لیے قوانین بنانے کے لیے استعمال کریں۔ قرآن میں 756 مرتبہ علماء کے لیے یہ سفارش کی گئی ہے کہ وہ ایک بہتر معاشرے کے لیے اصول و ضوابط کے ساتھ آنے کے لیے اپنے بہترین فیصلے کا استعمال کریں۔ اگر آپ سورہ (باب) روم آیت (جملہ نمبر) 31 اور 32 کو پڑھیں اور سمجھیں تو یہ واضح طور پر کہتی ہے: 30:31 اور 32۔

۔اس کی طرف توبہ کرو اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والوں میں سے نہ بنو"

یا] ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے مذہب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقے بن گئے، ہر گروہ اس میں خوش ہے جو [
۔اس کے پاس ہے

## مصنف کے بارے میں

انور موتن ایک میمن ہے جو اصل میں پاکستان سے ہے۔ 18 سال کی عمر میں، وہ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے روانہ ہوئے جہاں انہوں نے ہیوسٹن یونیورسٹی میں نیچرل سائنس اور ریاضی کے شعبہ کے ذریعے کمپیوٹر سائنس میں بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ وہ امریکی افرادی قوت میں 44 سال اور کراچی، پاکستان میں متعدد کام کرنے کے بعد ۶۳ سال کی عمر میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ اس . انھوں نے سیفوے ڈویژن آفس میں پروگرامر تجزیہ کار کے طور پر ۹ سال سے زیادہ کام کیا، پھر ۱۴ سال تک ریاض کے کنگ فیصل سپیشلسٹ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر میں سعودی عرب میں کچھ مشاورتی کام کیا۔ آخری بار، انہوں نے ۹ دسمبر ۲۰۱۶ کو ریٹائرمنٹ لینے سے پہلے ہیرس ہیلتھ سسٹم کے آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ میں ۱۷ سال تک کام کیا۔ وہ یہ کتاب لکھتے ہوئے اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ وقت گزارنے میں مصروف ہیں۔ اور محلے کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے کام بھی کر رہے ہیں - اسلامک سوسائٹی کے انٹرنشپ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی کام مصروف ہونے کے علاوہ ۔اتوار کوُاسلامک اسکول میں بچوں کو قران کی اورُاسلام مذہب کی تعلیم بھی دے رہے ہیں